تحقیق میں ندرت اور تنوع کا حامل علمی، تحقیقی اور اصلاحی مجلّہ

بدعاء
پیر طریقت شیخ الحدیث
مولانا شیر اسلم خان قدس سرہ

سہ ماہی الصدیق صوابی

جلد۱،شمارہ۱/ محرم الحرام تا ربیع الاول ۱۴۳۸ھ/ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء

زرتعاون....فی شمارہ:۵۰روپے

فہرستِ مضامین

حضرت مولانا عبدالحئی بادشاہ صاحب

دفتر سہ ماہی الصدیق
معهد الصديق للدراسات الاسلامية
بام خیل، صوابی، خیبر پختونخوا
ahmadmunfat@gmail.com
0345-9506009
0313-9803280

نعت شریف

حیات کچھ بھی نہیں عشقِ مصطفےٰؐ کے بغیر
نہیں ہے لُطفِ بقا لذّتِ فنا کے بغیر
سُناؤں کس کو حدیثِ الم ! کہاں جاؤں؟
مِرا نہیں ہے کوئی فخرِ انبیاء کے بغیر
خدارا مجھ پہ بھی لطف کرم ہو شاہِ اُمم
نجات ہوگی نہ میری تری رضا کے بغیر
جھکی ہے اور نہ جھکے گی کبھی خدا شاہد!
جبیں شوق مری تیرے نقشِ پا کے بغیر
ترے جمال کے پرتو ہیں مہر و ماہ و نجوم
تمام ہیچ ہیں یہ اک تری ضیاء کے بغیر
شِفا نہ ہوگی دوا سے مریضِ غم کو کبھی
ملے گی دل کو نہ راحت کبھی دُعا کے بغیر
خدا کرے میں فنا فی الرسولؐ ہو جاؤں
حیاتِ سرمدی ملتی نہیں فنا کے بغیر
ملُول کیوں ہے تو آدمؔ قبول ہوگی دُعا؟
شرف ملا ہے کسے عرضِ مدّعا کے بغیر!

سہ ماہی الصدیق کی اجراء کے محرکات

اسلام نے جہاں اس بات کا دعوی کیا ہے کہ وہ خالق کائنات کا دین ہے وہاں اس کے حق میں مضبوط دلائل بھی فراہم کیے ہیں، ان دلائل میں ہر دور کے اونچے سے اونچے انسان کو اپیل کرنے اور اس کے دل ودماغ کو پوری طرح مطمئن کرنے کی بھرپور قوت اور صلاحیت موجود ہے، جس طرح ہر شخص کا ایک ذہنی اور فکری سانچہ ہوتا ہے اسی طرح ہر دور کا بھی مخصوص اندازِ فکر ہوتا ہے، بہت سے وہ افکار وخیالات جو ماضی میں انسانی فکر پر چھائے ہوئے تھے اور جن پر لمبی چوڑی بحثیں ہوتی تھیں، آج ان کی سرے سے کوئی اہمیت ہی باقی نہ رہی اور ان کی جگہ دوسرے افکار وخیالات نے لے لی، افکار وخیالات کی تبدیلی سے مسائل حیات ہی نہیں بدلتے بلکہ ان کے اظہار کے طریقے اور بیان کے سلیقے بھی بدل جاتے ہیں، زبان، نیا اسلوب اور نئی طرز ادا اختیار کرتی ہے، نئی اصطلاحیں وضع ہوتی ہے، نئی منطق وجود میں آتی ہے، اور بحث ونظر کا نیا انداز اور نیا ڈھنگ جنم لیتا ہے لوگ اس تبدیلی کے اس قدر عادی ہوجاتے ہیں کہ قدیم انداز بیان اور طریقہ تعبیر ان کے لیے نامانوس اور ناپسندیدہ ہوجاتا ہے، وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو اپنے دور کی زبان وبیان ہی میں سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔

اسی وجہ سے اسلام کو بھی ہر دور کی علمی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور جو سوالات اور شبہات پیدا ہوتے رہے ان کا جواب بھی اس وقت کے استدلالی انداز میں دیا گیا، یہ کوشش کسی ایک میدان میں محدود نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا اس میں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ وغیرہ بہت سے علوم داخل تھے، اس سلسلہ میں امت کے علماء، محققین اور مجددین نے جو عظیم الشان خدمات سرانجام دی ہیں اسلامی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کرسکتی، ان بزرگوں نے اسلام کو اپنے عہد کی علمی زبان میں اتنے اونچے معیار سے پیش کیا کہ کسی بھی شخص کے لیے یہ کہنا آسان نہیں رہا کہ اسلام ہمارے دور کے علمی اور عقلی معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس کے تقاضے پورے نہیں کرتا یہ ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ امت اس سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہوسکتی۔

تاریخ کے اسی عمل کو آج پھر دہرانے کی ضرورت ہے اس وقت اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ

اسے آج کی علمی وفکری سطح سے پیش کیا جائے جن افکار ونظریات کی ہر سُو حکمرانی ہے ان کے مقابلہ میں اسلامی نظریات کی برتری ثابت کی جائے اوران ذہنی وفکری الجھنوں کو اسلام کی روشنی میں حل کیا جائے جن میں آج پوری دنیا گرفتار ہے، یہ دیکھ کر دلی مسرت محسوس ہوتی ہے کہ امت میں اس کا احساس جاگ رہا ہے اور مختلف محاذوں پر اسلام کی بڑی اچھی علمی خدمات انجام پارہی ہیں اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں۔

پورے اسلامی دنیا میں بہت سے ادارے، اکیڈمی اور یسرچ سنٹر برسرپیکار ہے، ہرادارہ، اکیڈمی اور یسرچ سنٹر اپنے اپنے طور پر علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، خصوصاً پاکستان میں تو یہ ادارے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہے اوران اداروں کے ارباب اہتمام بڑے خلوص کے ساتھ شب وروز محنت کر کے اپنے فرائض بجالاتے ہیں، صوبہ خیبر پختونخوا بھی اس علمی میدان میں تسلسل کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور کثیر تعداد میں علمی ادارے اوراکیڈمی کھل رہے ہے، جہاں سے علمی میدان کے شہسوار، قلم وقرطاس کے عباقرہ اپنی نگارشات اور کاوشوں سے علمی دنیا کو مستفید کررہے ہیں۔

اس علمی پیش رفت کے پیش نظر معهد الصديق بام خیل صوابی کے ارباب اہتمام نے تصنیف وتالیف کا شعبہ کھولنے کا عزم مصمم کرلیا، طویل مشاورت کے بعد دار الصديق لنشر البحوث الاسلامية والعلمية کے نام سے اس شعبہ کا اجراء کیا گیا، ادارہ کی کوشش ہوگی کہ خالص علمی انداز میں اسلام کا وسیع تعارف کرائے، اس کے اخلاقی، روحانی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اورمعاشی پہلوؤں پر تحقیقی لٹریچر فراہم کرے، دورِ جدید نے اسلام کی نسبت سے جوسوالات، شبہات اوراعتراضات پیدا کیے ہیں ان کا علمی محاکمہ اور محاسبہ اسلام کی روشنی میں پیش کرے اوراسلام کو سمجھنے کی راہ میں آج جو علمی دشواریاں پیش آرہی ہیں انہیں دور کرے، دار الصديق لنشر البحوث الاسلامية والعلمية، معهد الصديق کا ذیلی ادارہ ہے جس کا نصب العین اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعہ امت مسلمہ کو فکری پسماندگی سے نجات دلا کر اسلامی تہذیب کی احیاء کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے، دار الصديق کی نظر میں اسلامی تہذیب کی حیات نو کا واحد راستہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کو اعلیٰ تحقیق اور جانچ پڑتال کے بعد امت مسلمہ کے سامنے رکھنا ہے، ادارہ ہذا نے اپنی استطاعت کے مطابق امت کی اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش میں تحقیقات کی بنجر زمین پر دار الصديق کا پودا اس یقین کے ساتھ کاشت کیا ہے کہ..........

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

یہ سب اس امید پر کہ یہ سرزمین ایک نہ ایک دن ضرور آباد ہوگی اور یہاں کئی نہال کاشت کی جائیں گے، جن کے پروان چڑھنے سے اس دھرتی پر تحقیقات کا چمن آباد ہوگا (ان شاءاللہ) بہرصورت دینی بصیرت وآگہی کو فروغ دینے

والی کتب کی تالیف، ترجمہ اوراشاعت دار الصدیق کا مشن ہے، یہاں اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ جہاں تحقیق پر ہمارا اصرار ہے وہاں ہمارا فکری نہج بھی بڑی واضح ہے، ہمارے منابع میں قرآن وحدیث، تعامل صحابہ اوراسلاف کے اس طریق پر اعتماد ہیں جو تسلسل کے ساتھ ہمارے ہاں آرہا ہے، ان منابع سے دینی تعلیمات کے اخذ واستخراج میں ہماری روش بھی بڑی روشن ہے۔

لہٰذا دار الصدیق متنوع موضوعات اور امت مسلمہ کے زندہ مسائل پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اردو زبان میں تحقیقی لٹریچر پیش کرنے کے لیے کوشاں ہے اس امید کے ساتھ کہ امت مسلمہ کے اہل علم اس نہال تحقیق کی آبیاری میں اپنے حصے کا چلوبھر پانی ضرور ڈالیں گے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس علمی مہم کا مستعد بنائے اور اپنا فضل شامل حال رکھے۔

اس مہم میں دار الصدیق کو ان تمام اصحاب علم اور ارباب قلم کی تعاون درکار ہیں، جو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت اور افادیت محسوس کرتے ہیں، ان کا تعاون دار الصدیق کے لیے عزت وافزائی کا باعث ہوگا اور ادارہ ان کا بے حد ممنون ومشکور بھی ہوگا یہ کوئی خاکساری یا تکلف کی بات نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اسلامی مفکرین کے تعاون ہی سے یہ مہم سر کی جاسکتی ہے۔

اس کام کے لیے جن اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور مادی وسائل کی ضرورت ہے وہ دار الصدیق کو حاصل نہیں، لیکن اس امید پر اس کام کا آغاز کردیا گیا ہے کہ جس خدائے ذوالجلال نے اس کی توفیق اور ہمت عطا کی ہے وہ اس کی صلاحیت بھی دے گا اور ضروری وسائل بھی فراہم کرے گا، وہ چاہے تو بے مایہ انسانوں سے بھی بڑا کام لے سکتا ہے، اس کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔

دار الصدیق کے سامنے جو وسیع کام ہے اسی کا ایک حصہ سہ ماہی الصدیق کا اجراء بھی ہے، جس کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس میں شک نہیں کہ دینی اداروں سے اردو زبان میں بہت سے رسائل اور جرائد چھپتے ہیں، رسائل کی اس لمبی چوڑی فہرست میں صرف دو چار ہی رسائل ایسے ہیں، جو اعلیٰ معیار کی حامل اور ہر پڑھے لکھے حلقہ میں اچھی نظروں سے دیکھے جاسکتے ہے، یہ اس لیے کہ ان کے مقالات پر توجہ دی جاتی ہے اور کبھی کبھی وہ نقد ونظر اور بحث وتنقید کا موضوع بھی بنتے رہتے ہیں، اس کے باوجود ایک ایسے رسالہ کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کا واحد مقصد یہ ہو کہ اسلام کو دور جدید کے علمی معیار کے مطابق بغیر کسی معذرت خواہانہ رویہ کے پیش کیا جائے اور جس کے مقالات اور مضامین سے اسلام کے کسی نہ کسی پہلو کی وضاحت یا اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا ازالہ ہو اور اس کی علمی سطح بھی ایسی ہو کہ اس کے مباحث کو نظر انداز نہ کیا جاسکے۔

ہماری پوری کوشش ہوگی کہ الصدیق کواسی معیار کامجلّہ بنایا جائے کہ اس کے مقالات اورمضامین کا انداز زیادہ سے زیادہ علمی اورتحقیقی ہو،سطحی اورغیرعلمی چیزیں شائع نہ کی جائے اور جوبات کہی جائے وہ تحقیق کے ساتھ کہی جائے ، الصدیق ایک علمی وتحقیقی جریدہ ہے، یہ جریدہ دینی مدارس اورعصری جامعات کےاساتذہ اورطلباء کا اپنا جریدہ ہے جہاں اس جریدہ کاہدف عامۃ الناس کوعلم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے وہاں اس کا ایک اہم ہدف دینی مدارس اورعصری جامعات کےاساتذہ اورطلباء کے درمیان علمی وتحقیقی شوق اورجستجو پیدا کرنااوران کے زورقلم کومزیدنکھارنا ہے،اس حوالے سے یہ جریدہ ہرعالم اوردانشورکی علمی وقلمی تعاون اوران کی قیمتی مشوروں کامحتاج ہے،لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گرانقدر علمی آراء،تحقیقات اورنگارشات سے الصدیق کوزینت بخشیں،ہم اس میدان کےنووارد ہیں تاہم اگراصحاب علم ودانش نے بھرپورعلمی وقلمی تعاون سے سرفراز کیااورقدم قدم پرحوصلہ افزائی کی توانشاءاللہ الصدیق بہت جلد معیاری مجلوں کی صف میں شامل ہوگا۔

الصدیق میں اس بات کی بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کے مضامین میں تنوع ہو،اللہ نے چاہا تواس میں قرآن وحدیث کی تشریح، اسلام کی روشنی میں مختلف موضوعات پرتحقیق وتنقید،عقائد ونظریات سے بحث، تاریخ اورسیرت کا مطالعہ، اخلاقی، سماجی، معاشرتی اورسیاسی علوم کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ بھی لیا جائے گااورخالص فقہی مباحث بھی ہوں گے،عہد جدید کے تمام باطل ازموں کاعلمی اوراسلامی محاسبہ بھی کیا جائے گا، ہماری کوشش ہوگی کہ الصدیق کے ذریعہ ہم ایسے ناقدین،محققین اورتخلیق کاروں کوسامنے لائیں جوعلم وادب کی سطح کوبلندکرنا چاہتے ہوں۔

اللہ کاشکر ہے کہ رسالہ کوبعض اچھے اورنامور اصحاب قلم نے مستقل قلمی تعاون اوراپنی خدمات پیش کرنے کا وعدہ فرمایاہے، اس لیےتوقع ہے کہ اس کا معیار بلند سے بلندتر رہے گا اوراس کاہرشمارہ پچھلے شمارہ سے بہتر ہوگا ادارہ اپنے ان قلمی معاونین کاشکرگزار رہے گا۔

اس کے ساتھ ان تمام حضرات سے(جوکسی بھی موضوع پراسلامی نقطہ نظر سےتحقیقی اورتنقیدی کام کررہے ہیں) تعاون کی پرخلوص درخواست ہے رسالہ ان کا اپنا ہےاس لیےامید ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون سے دریغ نہیں کریں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ کواس کے مقاصد میں کامیابی عطا کرے اس راہ کی مشکلات کودور کرے اوراس کے کارکنوں کوصبروثبات اوراستقامت بخشے،نعم المولیٰ ونعم النصیر

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
محقق ومفکر، نئی دہلی۔ ہند

انبیائے کرامؑ کا مقصدِ بعثت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زمین میں آباد کرتے وقت ان کی ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کردیں اور کائنات کی تمام قوتوں کو ان کی خدمت میں لگا دیا، ان کے اعضاء وجوارح ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور نباتات وحیوانات ان کی غذائی اور دوسری ضرورتوں کی تکمیل میں، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، دریا اور دوسرے مظاہر نظام کائنات میں توازن قائم کیے ہوئے ہیں، ہوا، پانی، روشنی وغیرہ سے ان کی زندگی کا تسلسل قائم ہے، ان مادی ضروریات کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی روحانی ضرورت کی تکمیل سے غافل نہیں رہا ہے، اس نے ابتداء ہی سے اس کا بھی انتظام کررکھا ہے کہ انسانوں کو معلوم ہو کہ انھیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ انھیں پیدا کرنے والا کون ہے اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے؟ دنیا میں انھیں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے؟ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟

قُلْنَا اهْبِطُواْ مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ وَالَّذِينَ كَفَرواْ وَكَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ٥ (البقرہ:۳۸،۳۹)

اور ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کی بعثت

ابتداء میں تمام انسان راہِ راست پر قائم تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا تھا اس پر وہ عمل پیرا تھے، لیکن آہستہ آہستہ ان میں انحراف آنے لگا، نفسانی خواہشیں سر اٹھانے لگیں اور وہ سیدھے راستے سے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے، اس وقت ان کے درمیان اتحاد واتفاق باقی نہ رہ سکا، کچھ لوگ سیدھی راہ پر قائم رہے اور کچھ لوگ غلط راہوں پر جا پڑے، اس حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلآّ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُواْ (یونس: ١٩)

ابتداءً سارے انسان ایک ہی امت تھے، پھر انھوں نے اختلاف کیا۔

اس آیت میں ''لوگوں کے ایک امت ہونے'' کی بات کہی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابتداء میں راہِ حق پر قائم اور ہدایت یافتہ تھے:

کلهم علی شریعة من الحق (ابن عباس) كانوا علی الهدیٰ جمیعاً (قتادة) (ابوجعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان عن تاویل آتی القرآن، المعروف بتفسیر الطبری، دارالمعارف مصر ٢٧٥/٤–٢٧٦، ابوعبدالله، الجامع الاحکام القرآن المعروف بتفسیر القرطبی، الهیتة المصریة العامة للکتاب مصر، ١٩٨٧ء۔

امام رازی نے لکھا ہے: انهم كانو علی دین واحد وهوالایمان والحق وهو قول اكثر المحققین، فخرالدین الرازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الكبیر، المتكبة التوفیقیه، مصر ١١/٦)

بعد میں ان میں اختلاف برپا ہوا، اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں تمام لوگ راہِ حق پر قائم نہ رہ سکے، بعض لوگوں میں طرح طرح کی بُرائیاں پیدا ہوگئیں، انھوں نے مختلف مظاہر کائنات کو خدائی میں شریک کرلیا، سورج، چاند، ستاروں، درختوں، جانوروں اور دریاؤں وغیرہ کی پرستش شروع کردی، مٹی پتھر کے بت بنا کر انھیں پوجنے لگے، انسانی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی اور مختلف قومیں وجود میں آگئیں، ان قوموں کے مذاہب جدا جدا ہوگئے، لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین کو فراموش کرکے اپنی خواہشوں کی پیروی شروع کردی، جاہلی رسمیں ایجاد کرلی گئیں اور انھی حقیقی دین سمجھا جانے لگا۔

إِنَّ هَـذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ٥ وَتَقَطَّعُوٓا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ (الانبیاء: ٩٢، ٩٣)

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انھوں نے آپس میں دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا، سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے اور ان کے ساتھ اپنی روشن تعلیمات بھی بھیجیں، تاکہ لوگوں کے درمیان حق اور باطل، صحیح اور غلط کھل کر سامنے آجائے، ان پیغمبروں نے ان کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا، ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، شرک و بت پرستی سے روکا اور صاف الفاظ میں انہیں آگاہ کیا کہ کن کاموں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کن کاموں سے ناراض، اس طرح پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ ہوگیا اور حق و باطل میں امتیاز قائم ہوگیا، قرآن کہتا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُواْ فِيهِ (البقرہ: ۲۱۳)

(ابتدامیں) سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی، تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوگئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔

اس آیت میں انبیاء کے لیے ''مبشرین'' (بشارت دینے والے) اور ''منذرین'' (ڈرانے والے) کے الفاظ آئے ہیں، مبشرین کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں اور اس کے حکموں پر چلنے والوں کو بے پایاں اجر وانعام اور اچھے ٹھکانے کی خوش خبری دیتے ہیں اور منذرین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور کفر کی روش اختیار کرنے والوں کو وہ سخت سزا، زبردست بازپرس اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیے جانے سے ڈراتے ہیں (تفسیر طبری، ۲۸۰/۴، ابوحیان الاندلسی البحر المحیط، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۲۰۰۲ء ۲۱۸/۲) یہ اوصاف، جو انبیائے کرام کے فریضۂ منصبی اور مقصدِ بعثت کی وضاحت کرتے ہیں، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان کیے گئے ہیں:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلاَّ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (آیت: ۴۸)

ہم جو رسول بھیجتے ہیں، اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ (نیک کردار لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والے اور (بدکرداروں کے لیے) ڈرانے والے ہوں (مزید: النساء: ۱۶۵، الکہف: ۶۵، الصافات: ۲۷ وغیرہ)

آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رُسُلاً إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَآؤُوهُم بِالْبَيِّنَاتِ (الروم: ۴۷)

اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ انبیائے کرام اپنی قوموں کے پاس 'بیّنات' لے کر گئے، 'بیّنة' واضح دلیل کو کہتے ہیں خواہ وہ عقلی ہو یا حسّی البينة الادلالة الواضحة عقلية كانت أومحسوسة (راغب اصفهانی، المفردات فی غریب القرآن، دارالمعرفة بيروت، ۱۹۹۹ء ص: ۴۵) اس کا اطلاق انبیاء کو دیے جانے والے معجزات پر بھی کیا گیا ہے اور ان کے ذریعے انسانوں کو بھیجی جانے والی ہدایات اور تعلیمات پر بھی۔

تمام قوموں میں انبیاء بھیجے گئے

انسانی آبادی دنیا میں جہاں جہاں پھیلی اور جوں جوں اس میں گم راہی عام ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت کا سامان کیا، چنانچہ اس نے اپنے برگزیدہ بندوں کو صحیح تعلیمات اور واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا، یہ انبیاء تمام قوموں میں مبعوث کیے گئے، البتہ قرآن میں صرف ان چند بڑی بڑی قوموں کے احوال ہیں جن سے اہل عرب واقف تھے، ان کے پاس بھیجے جانے والے پیغمبروں اور ان کی دعوت کا بھی تذکرہ ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ ہادی و رہ نما اور بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہر قوم میں بھیجے گئے، آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو

مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے

إِنَّمَآ أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ٧)

تم تو محض خبردار کردینے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک راہ نما ہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيراً وَنَذِيراً وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ٢٤)

ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الأَوَّلِيْنَ (الحجر: ١٠)

اے نبی! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خطۂ زمین کے انسانوں کو اس حال میں نہیں رہنے دیا کہ ان تک اس کی ہدایت نہ پہنچی ہو صاحب تفہیم نے اپنی تفسیر کی جلد چہارم میں اس سلسلے کی ایک غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے، جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرمائے ہوں (الرعد:۷، الحجر:۱۰، النحل:۳۶، الشعراء:۲۰۸) مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں تا کہ غلط فہمی نہ ہو، اول یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ ہی انبیاء بھیجے جائیں، دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت وہدایت کے آثار اور اس کی رہ نمائی کے نقوش قدم جب تک محفوظ رہیں اُس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے، یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔'' (ص:۲۳۰،۲۳۱)

انبیاء ایک ہی دین کے علم بردار تھے

ساتھ ہی قرآن ایک دوسری حقیقت کو بھی واشگاف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف علاقوں اور خطوں میں اور مختلف قوموں میں جتنے بھی انبیاء بھیجے سب ایک ہی دین کے علمبردار تھے اور سب کی بنیادی دعوت ایک ہی تھی، ہر نبی کو اسی چیز کی وحی کی گئی تھی کہ اس کائنات کو وجود بخشنے والا اور انسانوں کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے اس لیے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، ہر نبی نے اپنی قوم سے اسی کا مطالبہ کیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُون (الانبياء: ٢٥)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوت (النحل:٣٦)

ہم نے ہرامت میں ایک رسول بھیج دیا اوراس کے ذریعے سے سب کوخبردار کردیا کہ اللہ کی بندگی کرواور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

اس آیت میں انبیاء کی بنیادی دعوت، یہ قرار دی گئی ہے کہ ''اللہ کی بندگی کرواور طاغوت کی بندگی سے بچو'' عربی زبان میں طاغوت کا مادہ ''طغی'' ہے، اس کے معنی حد سے آگے بڑھنے، سرکشی کرنے کے ہیں، طاغوت میں ہروہ چیز داخل ہے، جس کی اللہ واحد کو چھوڑ کر، پرستش کی جائے، علامہ قرطبیؒ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے

اتیٰ اترکوا کل معبود دون اللّٰہ کالشیطان و الکاھن والصنم وکل من دعا الی الضلال (ابوعبداللّٰہ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن (تفسیرالقرطبی) ۱۰۳/۱۰۰)

یعنی اللہ کے علاوہ ہر معبود کو چھوڑ دو، جیسے شیطان، کاہن، بت اور ہروہ چیز جوگم راہی کی طرف لے جائے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

اجتنبوا عبادۃ ما تعبدون من دون اللّٰہ، فسمیّ الکل طاغوتاً(فخرالدین الرازی، مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، ۲۰/۲۳،۲٤)

اللہ کے سوا جس جس کی عبادت کرتے ہو، سب کی عبادت ترک کردو، اللہ کے علاوہ تمام چیزوں کو طاغوت کہا گیا ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے ان آیات کی تشریح میں لکھا ہے:

وبعث فی کل أمۃ ای فی کل قرن وطائفۃ من الناس رسولاً، وکلھم یدعون الی عبادۃ اللّٰہ، و ینھون عن عبادۃ ماسواہ، فلم یزل تعالیٰ یرسل الی الناس الرسل بذلک۔ منند حدث الشرک فی بنی آدم، فی قوم نوح الذین أرسل الیھم نوح، وکان أول رسول بعثہ اللّٰہ الی أھل الأرض، الیٰ أن ختمھم بمحمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم الذی طبقت دعوتہ الإنس و الجن فی المشارق والمغارب۔ (تفسیر ابن کثیر، مؤسسۃ الریان بیروت، ۲۰۰۷ء ۱۲۹۹۳/۳)

اللہ نے ہر زمانے میں اور لوگوں کے ہر گروہ کے پاس ایک رسول بھیجا، یہ سب اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے اوراس کے علاوہ دوسروں کی عبادت سے روکتے تھے، سب سے پہلے بنوآدم میں قوم نوح میں شرک پھیلا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کے پاس بھیجا، وہ پہلے رسول تھے، جنھیں اللہ نے اہل زمین کے پاس بھیجا تھا، اس کے بعد وہ برابر لوگوں کی طرف رسول بھیجتا رہا، یہاں تک کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسالت کا خاتمہ کردیا، آپ کی دعوت روئے زمین کے تمام انسانوں اور جنات کے لیے عام تھی۔

قرآن میں مختلف قوموں کے احوال اور ان کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبروں کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے، اس ضمن میں ان کی دعوت بھی زیر بحث آئی ہے، ہر پیغمبر نے اپنی قوم سے ایک ہی چیز کا مطالبہ کیا: صرف

اللہ کی عبادت کرواوراس کے احکام سے سرتابی نہ کرو، سورۂ الاعراف اورسورۂ ہود میں قوم نوح، عاد، ثموداور مدین وغیرہ کا تذکرہ ہے، ہرقوم سے اس کے پیغمبر نے یہی کہا

يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ (الاعراف: ۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵، هود: ۵، ۶۱، ۸۴)

اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔

ان قوموں کا تذکرہ سورۂ الشعراء میں بھی ہے، وہاں ہر نبی کی دعوت ان الفاظ میں مذکور ہے

أَلَا تَتَّقُونَ o إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ o فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ

(الشعراء: ۱۰۶–۱۰۸، ۱۲۴–۱۲۶، ۱۴۲–۱۴۴، ۱۶۱–۱۶۳، ۱۷۷–۱۷۹)

کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

انبیاء کی مشترک دعوت

تمام انبیاء کی دعوت میں اشتراک پایا جاتا ہے اور وہ ایک ہی مشن کے حامل تھے، اس کا اظہار سورۂ الشوریٰ کی اس آیت سے بھی ہوتا ہے

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحاً وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (الشوریٰ: ۱۳)

اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ ہم نے جو دین تمھاری طرف وحی کیا ہے اسی کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کو بھی بھیجا تھا، حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے صاحبِ شریعت رسول ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری، درمیان میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے نام لیے گئے جو اولوالعزم رسولوں میں سے تھے، ان رسولوں کا یکجا تذکرہ سورۂ الاحزاب (آیت: ۷) میں بھی ہوا ہے، یہ تمام رسول جو دین لے کر آئے تھے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے (تفسیر ابن کثیر، ۴/۲۰۷)

ان آیات میں خاص طور سے مذکورہ رسولوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ وہ اصحاب شرائع ہیں یا ان پر ایمان لانے والوں کی بڑی جمعیت ہے وانما خص هولاء الانبياء الخمسة بالذكر لانهم أكابر الانبياء واصحاب الشرائع العظيمة والأتباع الكثيرة ،وخصّ نوحاً وابراهيم وموسىٰ وعيسىٰ بالذكر لأنهم أرباب الشرائع (كبير، ۱۳۸/۲۷ القرطبى، ۱۱/۱۶)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا نظریہ انقلاب

معاشرتی ناہمواری انقلاب کا پیش خیمہ

تمدن انسان کا فطری تقاضا ہے اوراس کی تشکیل کے لیے وہ کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کا ظہور تمدن کی صورت میں ہوتا ہے ایک الگ تھلگ جزیرے میں اگر مرد اورعورت ہوں تو وہ خود اپنے طبائع سے تمدن کو بروئے کار لا سکتے ہیں، انسانی معاشرے میں اس طرح جو تمدن معرض وجود میں آتا ہے، وہ اس وقت تک صحت منداور صالح رہتا ہے، جب تک کہ اس سے افراد معاشرہ کی اکثریت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، لیکن جب ان میں معاشرتی ناہمواری افراط وتفریط کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایک طبقے کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرا ادنیٰ ضرورتوں تک سے محروم ہو جاتا ہے تو یہ تمدن برباد کیے جانے کے قابل ہوتا ہے، جب کسی معاشرے کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑے تو پھر اس میں انقلاب کا آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک کاسب طبقے کی کمائی پر غیر کاسب طبقے کا قبضہ کرنا شریعت کے خلاف ہے، اسی طرح خود کاسبوں کے ایک گروہ کا ان کے دوسرے گروہ کی کمائی کا زیادہ حصہ ہتھیا لینا بھی ناجائز ہے، جب کسی معاشرے میں یہ حالت ایک وبائی شکل اختیار کر لے اور معاشی ناہمواری کی افراط وتفریط اس کا عام معمول بن جائے تو اس میں حتمی طور سے انقلاب آ جاتا ہے چنانچہ اس معاشرے کا ایک گروہ تو انقلاب کا مبلغ بنتا ہے اور دوسرے اسکے ہمدرد بن جاتے ہیں، بے شک ان ہمدروں کے اخلاق واطوار کا اثر اس انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے، لیکن جہاں تک اس انقلاب کی روح کا تعلق ہے، اس کا ترجمان وہی گروہ ہوتا ہے جو انقلاب کا مبلغ وقائد ہے۔

معاشی ناہمواری کی افراط وتفریط

ہر انسان کو اپنا رزق خود پیدا کرنا چاہیے لیکن اگر وہ کسی وجہ سے معذور ہے تو وہ دوسری بات ہے، ایک انسان

کا خود اپنی روزی پیدا کرنا ایک فطری تقاضا ہے اب ایک گھرانا ہے جس میں کمانے والے کم اور کھانے والے زیادہ ہیں ظاہر ہے یہ گھرانا جلد یا بدیر تباہ ہوگا، اسی طرح جس معاشرے میں کاسب کم ہوں اور کھانے والے زیادہ ہو وہ معاشرہ روگی ہے اور اس کا ختم ہونا لابدی ہے لیکن اگر ایک معاشرے میں کاسب زیادہ ہیں لیکن ان کی محنت سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اسے منتظمین کا ایک مخصوص طبقہ دوسروں سے زیادہ لے لیتا ہے یعنی حق کسب سے حق انتظام بہت زیادہ ہے تو اس صورت میں بھی یہ معاشرہ غیر صالح ہے اور ان کا جان بر ہونا مشکل ہے، غرض انسانیت کے فساد کی سب سے بڑی وجہ یہ معاشی ناہمواری کی افراط وتفریط ہے، اس سے جہاں ایک طرف فقر وفاقہ اور عیش وعشرت عام ہوتی ہے، وہاں دوسری طرف اخلاق بھی بگڑتے ہیں، چنانچہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی حالات کے اثرات قبول کرتے ہیں اسی لیے ہم عام مرفہ الحالی اور رلوگوں کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے معاملے میں بہت حد تک اشتراکیوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انسانوں میں جو اخلاق (ان کے عام معنوں میں) اور تفکر کی قوتیں ہیں ان کی تربیت کیسے ہو؟ بے شک ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس عنصر کو جو اخلاق اور تفکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

استحصال پسند سرمایہ داروں کے مظالم

بات یہ ہے کہ اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی نظام پائیدار نہیں ہوسکتا، چنانچہ ہم استحصال پسند سرمایہ داروں پر یہ الزام لگا لیتے ہیں کہ انہوں نے معاشرے کے بہت بڑے حصے کو معاشی لحاظ سے محتاج رکھ کر انسانیت کی سطح سے گرا دیا ہے، وہاں ہمارا دوسرا الزام ان پر یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے اس بڑے حصے میں اس طبقے کو جو اخلاق اور فکر کی ترقی دے سکتا تھا محتاج بنا کر اس قابل نہ رہنے دیا، چنانچہ اس لحاظ سے استحصال پسند سرمایہ داروں کا قصور دوہرا ہے۔

بدقسمتی سے جب کسی وجہ سے معاشرے کا وہ طبقہ جو اخلاق اور فکر کو ترقی دینے کی صلاحیتیں رکھتا ہے، اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لے سکتا تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہوتی ہیں، جن کی پہلی شکل تملق اور چاپلوسی ہے اس کے ذریعہ وہ طبقہ بڑوں کی خوشامد کرتا اور اس طرح اپنی معاشی احتیاجات پوری کرتا ہے، یہی مرض آگے چل کر غیر اللہ کی عبادت کا موجب بنتا ہے، اس منزل میں نفس ناطقہ کے ذاتی خواص سارے تباہ ہوجاتے ہیں اور انسانیت فاسد ہوجاتی ہے، اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کو برباد کرنے کے قدرتی اسباب پیدا ہوتے ہیں اسے ہم انقلاب کا نام دیتے ہیں۔

عالمگیر انقلاب کے داعی

قرآن مجید میں انبیاء کے جو قصے ہیں وہ اسی قسم کے انقلاب کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالمگیر انقلاب کے داعی تھے جس کا ایک مثالی نمونہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں سرزمین حجاز میں قائم کر کے دکھایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہؓ اس انقلاب کے دائرے کو اور وسیع کرتے ہیں اور ان کے عہد میں وہ سلطنتیں جو فساد انسانیت کا باعث تھیں ختم ہو جاتی ہیں اور صحت مند انسانیت کا کارواں آگے بڑھتا ہے، شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتابوں میں آپ کو اسلام کے اس تاریخی کردار کے بارے میں اس طرح کے افکار ملیں گے جنہیں وہ اپنی کتابوں میں بار بار بیان کرتے ہیں، شاہ صاحب کے نزدیک انبیاء کا کام فساد انسانیت کو ختم کر کے صالح انسانیت کے لیے سازگار حالات پیدا کرنا ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے وہ ائمہ انقلاب ہوتے ہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب سے بلند ہے اور وہ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سب سے زیادہ عالمگیر ہے۔

مفاسد کا علاج اور شاہ ولی اللہؒ

اب ایک طرف آپ کو حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں یہ افکار ملتے ہیں اور دوسری طرف وہ ان مفاسد کا ذکر کرتے ہیں، جو ان کے زمانے میں عام ہو گئے تھے اور جنہوں نے انسانیت عامہ کو خراب کر دیا تھا، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک ان مفاسد کا علاج وہی ہے، جو اس سے پہلے انبیائے کرام کے ذریعہ ہو چکا ہے اور جس کا ایک اعلیٰ نمونہ اسلام کا وہ تاریخی کردار ہے جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دور خلافت راشدہ میں وجود میں آیا اسے ہم شاہ ولی اللہ کا نظریہ انقلاب کہتے ہیں، اب ہم شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں سے ان کے ان افکار کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

حجة الله البالغة دوم میں ارشاد ہوتا ہے۔

> معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش و روزی بھی زمین پر مقرر کی اور زمین کے اشیاء سے انتفاع ان کے لیے مباح اور جائز گردانا، اور چونکہ حرص و آز کی وجہ سے ان کی نزاعات و جھگڑے ہونے لگے تو حکم الٰہی یہ قرار پایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے۔
>
> نیز چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور بلا باہمی تعاون کے انسان کی معاشی و معاشرتی تعمیر کی استقامت ناممکن ہے اس لیے قضائے الٰہی سے انسانوں کے لیے باہمی تعاون واجب اور لازم کر دیا نیز چونکہ نوع انسانی کا کوئی فرد بلا کسی سخت مجبوری کے تمدنی و عمرانی اور تمدنیات و عمرانیات

کے دخل واثر سے علیحدہ بے تعلق اور بے اثر نہیں رہ سکتا اور اس کا اصل اور حقیقی سبب اور وجہ یہی ہے کہ ہر انسان کے لیے اپنے مباح مال کا تحفظ ناگزیر ہے، نیز اس مال مباح کا جو ہر انسان کے لیے مخصوص اور مختص ہو چکا ہے جس کے ذریعہ ہر انسان اپنی امداد واستعانت کرتا ہے نمو اور اضافہ بھی ضروری ہے۔

اب اس مال میں نمو اور اضافہ شاہ صاحب کے الفاظ میں بلا باہمی تعاون معاشی کے متعذر اور محال ہے اور اس تعاون کے کچھ ایسے طریقے ہیں کہ جن کے بغیر شہری زندگی کی استقامت متغیر اور دشوار ہو جاتی ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

میں کہتا ہوں اس کی حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا مال اور ملکیت ہے اور کسی انسان کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز سے انتفاع کا حق سب سے زیادہ اس کے ہے دوسرے کو نہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں اصل اس بارے میں یہ ہے کہ جس مباح چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق علی الترتیب لازم ہوں تو ایسی صورت میں واجب ہی ہے کہ ترتیب کی اس قدر رعایت کی جائے کہ جس سے سب کو فائدہ پہنچے اور یہ فائدہ ایسا ہو جو کم سے کم سمجھا جائے۔

اس ضمن میں ایک حدیث بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابیض بن حمال المآربی کو نمک کا ایک چشمہ وار قطعہ عطا کر دیا تھا کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے اس کو نہ ٹوٹنے والا، نہ ختم ہونے والا مادہ دے دیا، راوی کہتا ہے یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قطعہ ان سے واپس لے لیا۔

میں کہتا ہوں اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ جن معادن اور کانوں میں زیادہ محنت ومشقت کی ضرورت نہ ہو ایسی معادن اور کانیں کسی ایک مسلمان کو دے دینا، عام مسلمانوں کے حق میں مضرت رساں ہے اور ان کے حق میں ایک قسم کی ضیق اور تنگی ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قطعہ نمک کو ابیض بن حمال المآربی سے واپس لے لیا۔

اس تمہید کے بعد حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

کسی شہر کے اندر مثلاً دس ہزار آدمی اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں اس وقت اس شہر کی مدنی شہری سیاست اور شہر کے باشندوں کے کسب اور پیشوں سے بحث ناگزیر ہوگی، وہ پیشے جن سے شہر کی

معیشت متوازن نہ رہے شاہ صاحب کے نزدیک فساد اور خرابی کا باعث ہوتے ہیں، اس صورت میں عطیہ حکمت الٰہی کے مطابق معروف و مستحسن طریقوں پر معروف و مستحسن کسب اور پیشے ان کے لیے لازم کردیے جائیں اور رذیل و خسیس پیشوں سے ان کو روک دیا جائے تو شہری باشندوں کی حالت یقیناً درست ہوجائے گی۔

معاشی فساد اور شاہ ولی اللہؒ

معاش کا یہ فساد شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک:

> شہر و ملک کے لیے ایسا متعدی ضرر رساں مرض اور روگ ہے کہ شہر اور ملک کے تمام گوشوں میں پھیل جائے گا اور اس طرح عام ہوجائے گا کہ تمام باشندوں کو اپنی زد میں لے لے گا، اور یہ مرض اور اس کا زہر شہر و ملک میں اس طرح جاری وساری اور پیوست ہوجائے گا، جس طرح کسی کو کتا کاٹ لیتا ہے اور اس کے سارے جسم میں اس کا زہر سرایت کرجاتا ہے اور یہی وہ مہلک وخطرناک مرض تھا جو عجمی ممالک میں بلائے بے درماں کی طرح تمام پر مسلط ہوچکا تھا چنانچہ خدائے قدوس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو القاء فرمایا کہ اس مرض مہلک کا علاج کریں اور مرض کے اصل مادہ کا قلع قمع کردیں (ص ۲۸۲ تا ۲۹۰)

شہروں کی بربادی کے دو اسباب

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشرے کے ان مفاسد کا ازالہ بھی تھا جو معیشت کے خراب طریقوں کی وجہ سے پیدا ہوچکے تھے، خود شاہ صاحب کے زمانے میں معاشرے میں اسی قسم کے جو مفاسد پیدا ہوچکے تھے آپ نے ان کا بھی ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:

> اس زمانے میں شہروں کی بربادی کے دو بڑے اسباب ہیں ایک یہ کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ چونکہ وہ فوجی یا عہدے دار ہیں اس لیے بیت المال پر ان کا حق ہے اور اس طرح ان کا کسب معاش کا ذریعہ صرف بیت المال بن کررہ گیا ہے، یا زہاد اور شعراء وغیرہ ہیں جن کو بادشاہوں کے صلہ کی عادت پڑگئی ہے اور اپنی معاش کا ذریعہ صرف بیت المال ہی کو سمجھ بیٹھے ہیں اور بغیر کسی خدمت کے بیت المال پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں یہ ان لوگوں کے ہاں جاتے ہیں اور ان میں کبیدہ خاطری پیدا کرتے ہیں اور شہری آبادی پر بار گراں بن کررہ جاتے ہیں۔
>
> دوسرا سبب یہ ہے کہ کسانوں، تاجروں، پیشہ وروں اور دست کاروں پر گراں ٹیکس لگائے جارہے ہیں اور ان پر حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے جس سے اطاعت گزاروں پر مصیبت آتی ہے اور برباد

ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ جو جری ہوتے ہیں وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، شہروں کی بہبود کا طریقہ یہی ہے کہ رعایا پر کم سے کم ٹیکس لگائے جائیں اور ضرورت کے مطابق محافظ ونگران مقرر کیے جائیں اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیے واللہ اعلم (ص ۱۲۲ حصہ اول)

معاشی، سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح اور شاہ ولی اللہؒ

شاہ صاحب کا یہ فرمانا ولیتنبہ اهل الزمان بهذه النكتة اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیے، اپنے دور کے ارباب حکم کے لیے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دعوت امور دین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی جملہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح پر مشتمل تھی، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کے ختم ہونے کے معنی کیا تھے؟ شاہ صاحب نے حجة الله البالغة حصہ اول میں اسے یوں بیان کیا ہے:

> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید میں وہ اقالیم صالحہ اور ممالک متمدنہ کہ جن میں معتدل مزاج کی تولید و پیداوار ہوا کرتی تھی، وہ دنیا کے دو بڑے زبردست بادشاہوں کے ماتحت تھے ایک کسریٰ کہ عراق، یمن، خراسان اور ان کے متصل کے تمام ممالک پر اس کا تسلط واقتدار قائم تھا اور ماوراء النهر اور ہندوستان کے تمام بادشاہ، راجہ اس کے محکوم وباجگزار تھے اور ہر سال انہیں کسریٰ کو ایک مقرر خراج ادا کرنا پڑتا تھا، دوسرا قیصر تھا شام، روم اور اس کے نواح کے تمام ممالک پر اس کا تسلط واقتدار قائم تھا اور مصر، مغرب اور افریقہ وغیرہ کے تمام سلاطین اس کے زیر فرمان اور باج گزار تھے، ان دو زبردست شہنشاہوں کی دولت وطاقت کو توڑ دینا اور ان کے ملک پر تسلط واقتدار قائم کر لینا ایسا تھا گویا تمام روئے زمین پر تسلط واقتدار قائم کر لیا گیا، ان سلاطین کی غیر معتدل مرفہ الحالی اور مفرطانہ عیش پرستی کے جراثیم اور مہلک عادات واطوار کی گندگیاں ان تمام ممالک میں سرایت کر چکی تھیں، جو ان کے تسلط واقتدار کے زیر فرمان تھے اور تمام باشندے ان کے رنگ میں رنگ چکے تھے اس لیے ان کی عادات واطوار ورسوم ورواجات کو تبدیل کر دینا اور ان کو ان خطرناک مہلک جراثیم سے پاک صاف کر دینا گویا دنیا کے تمام ممالک کی اصلاح ودرستگی تھی اگرچہ بعد میں جا کر ان امور نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔
>
> حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کیا کہ ملت ودین کی کجی کو دور کیا جائے اور ایک ایسی امت اور قوم تیار کی جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری قوت سے انجام دے اور لوگوں کی فاسد رسوم یکسر تبدیل کر دے، تو یہ امر اس بات پر موقوف تھا کہ ان ہر دو بڑی سلطنتوں کو دنیا سے نیست ونابود کر دیا جاتا، اور اس مقصد کو سہولت وآسانی سے حاصل کرنے

کے لیے ضروری تھا کہ ان ہر دو جابر سلطنتوں سے تعرض کیا جاتا کیونکہ انہی دو سلطنتوں کے حالات تمام متمدن اور صالح ممالک میں سرایت کئے ہوئے تھے یا سرایت کرتے چلے جاتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو سلطنتوں کے زوال اور قلع قمع کا فیصلہ کیا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی کہ ھلك كسرىٰ ولا كسرىٰ بعده وھلك قيصر ولاقيصر بعده ''کسریٰ ہلاک ہوا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا اور قیصر ہلاک ہو گیا اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا'' اور حق اس طور پر نازل ہوا کہ روئے زمین سے باطل کی جڑیں اس طریقہ سے اکھاڑ دی گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے ذریعہ عرب سے باطل کا قلع قمع کر دیا گیا اور پھر عرب کے ذریعہ ان ہر دو جابر سلطنتوں کا قلع قمع کر دیا گیا اور پھر ان کے ذریعہ تمام عالم کی باطل طاقتیں توڑ دی گئیں اور دنیا سے باطل، ناروا امور کا خاتمہ کر دیا گیا اور دنیا کو پاک وصاف کر دیا گیا وللہ الحجة البالغة۔

ایک اور جگہ شاہ صاحب سلاطین عجم وروم کی بداعمالیوں کا مقابلہ اپنے دور کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں سے یوں کرتے ہیں لکھتے ہیں:

معلوم ہونا چاہیے کہ سلاطین عجم وروم قرن ہاقرن سے سلطنتوں کے وارث چلے آرہے تھے اس لیے یہ لوگ سرتاپا دنیوی لذتوں اور عیش کوشیوں کے عادی ہو چکے تھے آخرت کو بالکل فراموش کر چکے تھے شیطان ان پر پوری طرح غالب ہو چکا تھا اور انہی امور کو انہوں نے مقصد حیات سمجھ لیا تھا..........شدہ شدہ یہ حالت ہوگئی کہ وہ امیر، رئیس، یا سردار جس کی کمر کی پیٹی اور تاج کی قیمت ایک لاکھ درہم سے کم ہوتی، اس پر طعن وتشنیع کرتے، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس عالی شان محل، شاندار قصر وایوان، حوض، حمام، باغات، خوبصورت قیمتی چوپائے، حسین غلام وخدام اور لونڈیاں نہ ہوتیں، اس پر طعن وتشنیع کیا کرتے، اس قسم کے امور کا ذکر بہت طویل ہے اور ان کی داستانوں کے دہرانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اپنے ملک کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں کا حال دیکھ لو، غرض اس قسم کے مہلک اور خطرناک امور ان لوگوں کی معاشرت کے اصول اور جز وزندگی بن گئے تھے اور ایسی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے کر دیے جاتے تب بھی ان کے دلوں سے ان کا نکلنا دشوار تھا، شہر وملک کے تمام اطراف وجوانب میں یہ لاعلاج امراض اس طرح پھیل گئے تھے کہ لوگ ایک عام مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے..........تمام کے دامن اس سے الجھ گئے تھے اور تمام کو عاجز ومغلوب کر کے رکھ دیا تھا، (آخر میں) جب دنیا میں یہ عظیم ترین مصیبت عام ہوگئی اور یہ مہلک وخطرناک مرض

نہایت سخت ہوگیا، روم وعجم کے تمدن غیر صالحہ نے دنیا کی کمر توڑ دی تو ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ مقربین کی ناراضگی ظاہر ہوئی، اس وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اسی میں تھی کہ اس مہلک مرض کا علاج کیا جائے.........اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کردیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت قائم کر کے عجمیوں کی سلطنت ختم کردی جائے اور یہ شکل اس طرح وقوع پذیر ہوئی کہ هلك كسرىٰ ولا كسرىٰ بعده وهلك قيصر ولا قيصر بعده۔

معاشی فراغت میں حد اعتدال

شاہ صاحب نے البدور البازغة میں معاشی فراغت (ترفہ) میں ایک حد اعتدال قائم کرنے کی تلقین کی ہے، فرماتے ہیں:

> اس کے بارے میں دو متعارض قیاس ہیں ایک یہ کہ معاشی فراغت اچھی چیز ہے، طبیعت اس کا تقاضا کرتی ہے اس سے مزاج، دماغ اور دل صحیح رہتا ہے، اخلاق اور علوم اس کی وجہ سے استقامت اختیار کرتے ہیں اور یہ کہ تمام کند ذہنی اور بد خلقی، برے کھانے اور دوسری بری تدابیر کا نتیجہ ہوتی ہے نیز ذہانت، نیک خلقی اور لطف و مروت صحت مند تدبیروں کا حاصل ہے، اس ضمن میں دوسرا قیاس یہ ہے کہ معاشی فراغت بری ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے ہوتے ہیں اور انسان دوڑ دھوپ میں پڑ کر آخرت سے منہ موڑ لیتا ہے۔

شاہ صاحب ان دونوں پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> کہ معاشی فراغت یعنی رفاہیت میں حد اعتدال ہی اچھی چیز ہے جس سے کہ انسان جملہ خوبیوں کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خرابیوں سے بچا رہے، رفاہیت میں افراط وتفریط دراصل معاشی ناہمواری سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

آج کل کے سیاسی نظاموں میں اہل علم صرف ایک امیر کی اطاعت کو مرکزیت کے لیے ضروری نہیں سمجھتے ان کے نزدیک اس سے خرابیاں پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہیں، شاہ صاحب اس کا علاج یہ تجویز کرتے ہیں:

> کہ ایک ''بورڈ'' ہو اس کے ارکان کے ہاتھ میں الگ الگ اختیارات ہوں، جہاں تک میری معلومات ہیں، میں نے کسی مذہبی عالم کے ہاں اس طرح کا فکر نہیں پایا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک کامل ریاست میں، جس میں بہت زیادہ افراد ہوتے ہیں، نظام قائم رکھنے کے لیے ایک ایسا آدمی ہونا چاہیے جو اکیلا سب امور کی کفالت کرے اور وہ الامام الحق ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے وقلما يوجد ذلك اور ایسا آدمی کم ہی ملتا ہے چنانچہ اکثر دو تین

امورایک آدمی کی تحویل میں ہوتے ہیں،اور باقی امور دوسرے کے پاس(البدور البازغہ ص ۷۳)
شخصی حکومت کے بجائے عقلائے قوم کی حکومت کی یہ تجویز پارلیمنٹری نظام کا نقطہ آغاز ہوسکتی تھی کاش!اس وقت اس کی طرف توجہ کی جاتی۔

روحانی ومادی زندگی کی وحدت

اقترابات جن سے مراد قرب الٰہی کے حصول کے ذرائع اور ارتفاقات جو عبارت ہیں معاشی،سیاسی واجتماعی تدابیر سے،شاہ صاحب کے نزدیک اسلام ان دونوں کے لیے صراط مستقیم پیش کرتا ہے،اس نے قیصریت وکسرویت کو ختم کرکیاارتفاقات میں راہ وسط پیدا کی،اور ہر قسم کے شرک کی تردید کرکیااقترابات کا صحیح مقام معین کیا،شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت آفریں طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ انہوں نے اس دور میں اسلام کی اس ہمہ گیر روح کو بے نقاب کیا، ایک تو انہوں نے روحانی زندگی ومادی زندگی (اقترابات وارتفاقات) کے ایک وحدت ہونے کا اثبات کیا،اور بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ کرنا بھی تھا، دوسرے انہوں نے تمام مذاہب کے مشترک مبادی معین کئے اوراس طرح مسلمانوں کے سامنے ازسرنو وہ تمام ضمنی وسعتیں بے نقاب کی جو صدیوں سے ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔
یہ اساسی نظریہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی اس دعوت کا جسے میں ان کی ''دعوت انقلاب'' کا نام دیتا ہوں۔

جاوید اکبر انصاری
محقق، مفکر کراچی

سرمایہ دارانہ مغربی تہذیب کا محاکمہ

روشن خیال اعتدال پسندی (Enlightenment moderation) ایک بہت معنی خیز اصطلاح ہے جس کا خصوصاً آج کل حکومتی حلقوں میں بہت چرچا ہے اور کثرت کے ساتھ اس کو استعمال کیا جا رہا ہے، اس مضمون میں اس اصطلاح کے معنی پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

روشن خیالی مغربی تہذیب میں ایک بڑا مکتب فکر ہے اور تحریک تنویر کے نام سے معروف ہے، جب روشن خیالی کی بات کی جاتی ہے تو اس کے تہذیبی تانے بانے اٹھارویں صدی کی اس تحریک سے جا ملتے ہیں جو بنیادی طور پر کانٹ سے شروع ہوئی، ہر چند کہ سترھویں صدی میں سائنٹفک میتھاڈولوجی کی تحریک میں بھی اس کے آثار تلاش کیے جا سکتے ہیں، لیکن بنیادی طور پر مغربی تہذیب میں جو الحاد آیا ہے اور مغربی تہذیب بن گئی وہ روشن خیالی یا تحریک تنویر (Enlightenment moderation) کے نتیجے میں ہی بنی، گویا کہ جو لوگ آج ہمارے ملک میں روشن خیال پسندی کا پرچار کرتے ہیں تو وہ بنیادی طور پر ہماری تہذیب کو اسی تحریک کی تعلیمات سے جوڑ دینا چاہتے ہیں اور وہ ہماری تہذیب کو اس تحریک کے ماتحت کر دینا چاہتے ہیں، لہذا ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ تحریک تنویر سے آگاہ ہوں اور اس کا محاکمہ اسلامی بنیادوں پر کر سکیں، تحریک تنویر کے بارے میں یہاں چند بنیادی باتیں عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک علمی تحریک ہے اور بنیادی طور پر علمیاتی تصورات میں تغیر کی تحریک ہے اور یہی علمیاتی تغیر یورپ وغیرہ میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا باعث ہوا، تحریک تنویر بنیادی طور پر عیسائی علمیت کی رد تھی، اس علمیت میں جو بنیادی سوالات حیات سے متعلق، کائنات سے متعلق، علم سے متعلق تھے ان کی تشریح ملتی تھی اور یہ تشریح عیسائیت سے متاثر تھی، اب اس کی جگہ ایک نئی علمیت نے غلبہ حاصل کیا، تحریک تنویر کے نتیجے میں جنم لینے والی اس نئی علمیت کی مندرجہ ذیل خصوصیات تھیں:

☆ علم صرف وہ ہے جو انسان اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر دریافت کرتا ہے۔

☆ علم حاصل کرنے کے صرف دو ذرائع ہیں: (۱) فکر،عقل (۲) تجربہ

☆ جو چیز فکر اور تجربہ کے احاطہ میں نہ آئے وہ علم کے دائرے سے خارج ہے۔

ان بنیادی مفروضات کو قائم کر کے عیسائیت کی بنیادی تعلیمات کو رد کر دیا گیا، عیسائی تصورات خدا، حضرت عیسی علیہ السلام، عالم بالا، فرشتے، آخرت ان سب کے متعلق کہا گیا ہے کہ علمیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ نہ تو فکر ان کا احاطہ کر سکتی ہے یعنی نہ استقرائی منطق (Inductuive Logic) اور نہ استخراجی منطق (Deductive Logic) کے ذریعے الٰہیات اور اس کے تصورات کو ثابت کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ تجربے اور مشاہدے کے دائرے سے بھی یہ ماوراء ہیں کیونکہ نہ خدا اور اس کے متعلق تصورات کو دیکھا جا سکتا ہے، نہ چھوا جا سکتا ہے اور نہ حواس کے کسی اور ذریعہ سے ان کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس تصور علمیت کے محاکے کے ضمن سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی بھی Epistemology یا تصور علمیت اپنے کچھ (Ontological) اور (Cosmological) مفروضات رکھتا ہے، یعنی یہ کہ انسان کا اپنی حیثیت اور ماہیت کے بارے میں کیا خیال ہے اور وہ جس کائنات میں رہ رہا ہے اس سے اپنے تعلق کو کیسے پہچانتا ہے، گویا کہ ہر تصور علمیت کے پیچھے کچھ مابعدالطبیعاتی تصورات پائے جاتے ہیں تحریک تنویر نے جو مابعدالطبیعاتی تصورات انسان کے بارے میں قائم کیے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ انسان قائم بالذات ہے اور اس بات کا مکمل مکلّف ہے کہ وہ دنیا کو جان سکے اور اس کو جیسا بنانا چاہتا ہے ویسا بنا سکے، اس بات کو ہم آسانی کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ تحریک تنویر کا بنیادی کلمہ لاالہ الاالانسان ہے۔

☆ تمام انسان اس کلمہ میں برابر کے شریک ہیں اور ان معنوں میں مساوی ہیں۔

☆ تعقل اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان کائنات پر اپنی مرضی کو مسلط کرتا چلا جائے اور اپنی خدائی سلطنتوں کی وسعتوں میں لامتناہی اضافہ کرتا چلا جائے۔

اس لیے مغربی تہذیب کے نقطہ نگاہ سے ان مابعدالطبیعاتی تصورات کے انکاری لوگ انسان کہلانے کے لائق نہیں ہیں، اس لیے جب امریکا میں کئی ملین ریڈانڈینز کو تہہ تیغ کیا جاتا رہا تو ان کے مشہور فلسفی نے اس بہیمیت کو جواز فراہم کیا، اس نے کہا کہ یہ ریڈانڈینز تو سرے سے انسان ہی نہیں ہیں، ان میں اور جنگلی بھینسے میں کوئی فرق نہیں، اسی طرح جارج واشنگٹن نے انہیں بھیڑیے کہہ کر ان کے قتل عام کا جواز فراہم کیا، انہیں کوئی انسانی حقوق حاصل نہیں،

کیونکہ یہ اپنی انسان ہونے کی حیثیت سے ہی انکاری ہیں،اور کلمہ لاالـہ الا انسان پر ایمان نہیں لاتے (اس لیے اصلی انسانی حقوق ابوغریب جیل اور گوانتاناموبے میں پریکٹس کیے جاتے ہیں) گویا روشن خیالی یہی ہے کہ انسان قائم بالذات ہے اور اپنی خدائی کو قائم کرنا اس کی عقل کا تقاضا ہے،اس لیے تسخیر کائنات کو واحد معقول مقصد کے طور پر قبول کر لیا جائے،اس روشن خیالی کی تین بنیادی قدریں ہیں۔

آزادی: انسان جو چاہنا چاہے چاہ سکے،اس کی چاہت پر کسی بھی قسم کی بندش اور قدغن نہ ہو اس تصور کا عام ہونا آزادی ہے۔

مساوات: ہر ایک کو یہ مساوی حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہ سکے اس میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے،نمازی اور غازی برابر ہیں،فرد کی چاہتیں جیسی بھی ہوں،صرف اس بناء پر وہ کسی فرد سے افضل یا کمتر نہیں ہوسکتا،بہت بڑا مفکر رالز (Rawls) جس کا حال ہی میں انتقال ہوا،اس نے اپنی کتاب میں یہ دلیل دی ہے کہ ایک شخص اگر اپنے لیے خیر یہ سمجھے کہ وہ ایک متعین علاقے کے اندر گھاس کی پتیاں گنے گا اور دوسرا اپنے لیے یہ منتخب کرے کہ وہ مخصوص علاقے میں منشیات کا خاتمہ کرے گا تو کوئی بنیاد نہیں بنتی کہ ہم ایک تصور خیر کو دوسرے کے تصور خیر پر برتری دیں۔

اگر ہم روشن خیالی کے اس مفروضے کو مان لیں کہ تمام تصورات خیر کی یکساں قدر ہے تو اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ تمام تصورات خیر لایعنی ہیں،اگر میں یہ کہوں کہ مرا کوئی بھی نام ہوسکتا ہے تو پھر میرے مخصوص نام جاوید انصاری کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی،مغرب میں خیر کا یہ تصور رہ جاتا ہے کہ آپ وسائل میں اضافہ محض کرتے چلے جائیں،جس کے نتیجے میں آپ جو چاہنا چاہ سکیں اس کو حاصل کر سکیں۔

ترقی: تحریک تنویر کی تیسری اساسی قدر ترقی ہے،سرمائے کی بڑھوتری میں ترقی،کیونکہ اکیلی وہ چیز جس کے نتیجے میں جو چاہنا چاہوں چاہ سکتا ہوں،وہ سرمایہ ہے اس لیے کہ اگر میرے پاس سرمایہ ہوگا تو مسجد بھی بنا سکتا ہوں،شراب خانہ اور جوا خانہ بھی،نماز پڑھنے بھی جا سکتا ہوں،شراب پینے بھی اور جوا کھیلنے بھی،اس لیے خیر کا مطلب سرمایہ کی بڑھوتری محض ہے،مغربی تہذیب میں بظاہر اس بات کی آزادی ہے کہ انفرادی زندگی میں تو خیر کا کوئی تصور اپنایا جا سکتا ہے اور اسے مسلسل بدلا بھی جا سکتا ہے،گویا انفرادی زندگی میں جو بھی خیر ہوگا وہ (Trivial) اور مہمل ہوگا،لیکن پبلک آرڈر کی تعمیر وتخلیق سرمایہ کی بڑھوتری کے اصول پر ہوگی،اس لیے انفرادی زندگی میں تو انسان مساوی القدر ہیں لیکن پبلک لائف میں درجہ بندی موجود ہے اور جو سرمایہ کی بڑھوتری میں زیادہ معاون ہوگا،اس کی قدر زیادہ ہوگی جس کے پاس ارتکاز سرمایہ زیادہ ہوگا،مارکیٹ میں وہی برتر تصور ہوگا۔

مغربی تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑھوتری میں ضم کر دے،وہ سرمائے کی مکمل غلامی اختیار

کرے،مغرب کا یہ تصور دراصل شرعظیم ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ انسان اللہ سے بغاوت کرے اور اعلان کرے کہ انا ربکم الاعلی اور یہ کہ انسان کی زندگی کا مقصد اپنی خدائی کی سلطنتوں اور وسعتوں میں مستقل اضافہ کرتے چلے جانا ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ روشن خیال اعتدال پسندی کوئی بے ضرر چیز یا غیر جانبدار (Neutral) چیز نہیں ہے، بلکہ اسلامی اقدار کے لیے زہر قاتل چیز ہے اور اس کا تصور خیر خالصتاً شر ہے۔

ان تصورات کو دنیا پر لاگو کرنے کے لیے اور ان کے نفاذ کے لیے جو ہتھیار اور حکمت عملی استعمال کی گئی ہے، وہ سوشل سائنسز کے ذریعے فروغ کی گئی ہے، سوشل سائنسز تحریک تنویر کے فلسفے سے مربوط ہیں اور ان کا مقصد مغربی تہذیب کی انہی قدروں کا فروغ ہے، اس لیے کہ اگر ہم معاشیات کو بطور ایک علم کے قبول کرلیں تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم اس تصور انسان، تصور کائنات اور تصور عقلیت کو قبول نہ کریں کہ جو معاشیات کے بنیادی مفروضات فراہم کرتے ہیں، ہمارے اسلامی معیشت دانوں کی بنیادی کمزوری یہی ہے کہ مغربی فلسفے کو جو کہ علم معاشیات کے پیچھے ہے ان کو فطری تصور کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا تصور عقل کے مطابق نہیں ہوسکتا، اس لیے ہم معاشیات کو اسلامی بناسکتے ہیں، اس وقت روشن خیال اعتدال پسندی نے علماء کے اندر درآنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ سوشل سائنسز کی اسلام کاری (Islamization of Social Science) ہے۔

عیسائیت کے رد سے الحاد کو فروغ حاصل ہوا اور مغربی تہذیب کو فکر اور عقل کے تقاضے کے طور پر قبول کرلیا گیا، اس طرح کی کوشش ہمارے یہاں بھی ہے کہ سوشل سائنسز کی اسلام کاری کے نتیجے میں مغربی فلسفے کو قابل قبول بنایا جائے، اس لیے کہ یونانی فلسفے کو اسلامیانے کی جو کوشش معتزلہ نے کی، اسے امام غزالیؒ شکست دے چکے تھے اور ۱۸ویں صدی میں یورپ میں جو تحریک کامیاب ہوگئی اس سے چھ سو سال پہلے امام غزالیؒ مسلم دنیا میں اسے شکست دے چکے تھے، تجربیت و تفکر کا چرچا مسلم دنیا میں سات سو سال پہلے ہوا مگر امام غزالیؒ، امام اشعریؒ اور راسخ العقیدہ علماء علوم اسلامی کی بنیاد پر اس تحریک کو شکست دے چکے تھے۔

جب روشن خیال اعتدال پسندی کی بات کی جاتی ہے تو دراصل اس فکر اور سائنٹفک میتھوڈولوجی کو اپنانے کی بات کی جاتی ہے جس کے مابعد الطبیعاتی مفروضات اور فلسفے کی کوئی توجیہ اسلامی تناظر میں اب بیان نہیں کی جاسکتی، کوئی اسلامی دلیل نہیں دی جاسکتی کہ انسان قائم بالذات ہے اور یہ ہمارے علمائے کرام کا کارنامہ ہے۔

سوشل سائنسز کی اسلام کاری کا یہ پروجیکٹ جو امریکا میں شروع ہوا اور شروع سے ہی امریکا کے پیسوں سے چل رہا ہے اس میں بنیادی کردار شاہ فیصل مرحوم نے ادا کیا، اس وقت ہمارے ملک میں کوشش ہو رہی ہے کہ مغرب کے جو بنیادی مفروضات ہیں کسی طریقے سے ان سے توجہ ہٹادی جائے اور مغرب نے جو طریقہ مذہب کو ہٹا کے الحادی نظام

زندگی کے فروغ کا اپنایا ہے، وہی طریقہ یہاں بھی اختیار کیا جائے، استعمار کو یہ امید ہے کہ آخر جب عیسائیت نے تبدیلی علیت کا مقابلہ نہیں کیا اور اس کے لیے عیسائیت میں کوئی تحریک مزاحمت نہ چلی تو اسلامی تہذیب بھی اس کا مقابلہ نہیں کر پائے گی، ہر جگہ عیسائیت نے استعمار کے جز لاینفک کے طور پر اس کو سپورٹ کیا، لاطینی امریکا میں ریڈ انڈینز کے قتل میں، فلپائن، افریقہ سب جگہ وہ استعمار کی شریک جرم رہی ہے، بنیادی طور پر یروشلم کی عیسائی فکر کو بالکل تج دیا گیا اور عیسائیت سے بالکل نکال کر پھینک دیا، عیسائیت نے اپنا مفاد اس میں تلاش کیا اور استعمار سے سمجھوتہ کر لیا اور صرف اس پر اکتفاء کر لیا کہ کچھ عیسائی علامتیں محفوظ رہیں اور بس، ہمارے دشمن اسلام کو بھی اس طرح بنا دینا چاہتے ہیں کہ وہ محض چند علامتوں تک محدود ہو کر رہ جائے، وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام کوئی نظام زندگی نہیں بلکہ محض ایک رویہ اور کیفیت کا نام ہے۔

اسلامی جمہوریت کی باتیں بھی اسی پس منظر میں کی جاتی ہیں، سرمایہ دارانہ ٹیکنالوجی کو اسی ضمن میں جواز فراہم کیا جاتا ہے، سائنس کے متعلق تو یہ بات بہت عام ہے کہ سائنس اور اسلام کا بہت قریبی تعلق ہے، بلکہ یہ تو اسلام اور اسپین کے مسلمانوں سے ہی لی گئی ہے، سوشل سائنسز کی اسلام کاری کی بات مختلف حلقوں میں زور و شور سے کی جاتی ہے کہ جب عیسائی علماء الحاد کے غلبہ پر راضی ہو گئے، انہوں نے سوشل سائنسز کو قبول کر لیا تو مسلمان علماء بھی اس پر راضی ہو جائیں گے، مسلمان علماء بھی اس بات کو قبول کر لیں گے کہ اسلام محض علامتی طور پر محفوظ ہو، اور دوسری طرف آزادی، مساوات اور ترقی بھی جاری رہے گی، مساجد اور ان کی آرائش بھی برقرار رہے، اور دین اسلام عیسائیت کی طرح محض نفسیاتی سکون کے لیے استعمال ہوتا رہے، سوشل سائنسز کی اسلام کاری کا یہ پروجیکٹ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے تحت بہت زور و شور سے جاری ہے، اس پروجیکٹ کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اسلام کو بطور نظام کے نہیں بلکہ ایک رویہ اور کیفیت کے طور پر متعارف کروایا جائے۔

ہابرماس جو جرمن فلسفی ہے اور آج کی دنیا کا سب سے بڑا (Rationalist) معقولی فلسفی ہے، وہ ایران کا مستقل دورہ کرتا رہتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسلام ایک Life world ہے، یہ کوئی نظام نہیں ہے اس لیے مسلمان یہ بات کہنا چھوڑ دیں کہ شریعت کا نفاذ ایک لازمی امر اور ضروری چیز ہے اور مغرب سے ہمارا کوئی مقابلہ نہیں ہے، مسلمان جہاد کو چھوڑ دیں وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کے اندر اتنی گنجائش موجود ہے کہ اس کے اندر مسلمانوں کی اسلامیت بھی فروغ پاتی رہے، تاریخی لحاظ سے دیکھیں تو ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماء ہند کے قیام کے بعد سے ہم نے دستوریت کے اندر اپنی پناہ دیکھی، ۱۹۲۰ء سے پہلے کی جدوجہد جو حضرت شیخ الہند مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت قطب العالم مہاجر مکی رحمہم اللہ کی وہ جہاد کی جدوجہد تھی، وہ اس بات کی جدوجہد تھی کہ ہم انگریز کو بے دخل کر دیں گے ہم نے مدرسہ دیوبند قائم کیا کہ وہاں مجاہدین تیار کریں گے، ۱۹۲۰ء کے بعد یہ سب چیزیں رد ہو گئیں، ہم نے حقوق مانگنا شروع کر دیے، اور ہم حصوں میں بانٹ دیے گئے۔

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن کی فکر اور اس کے نظام پر آپ سے صاد کرالیں اور آپ کہہ دیں کہ اسلامی معاشیات، اسلامی سیاسیات اور اسلامی عمرانیات کا ہماری فکر میں ایک مقام ہے اور نفسیات سے بھی اسلام کا ایک خاص تعلق ہے، جب آپ نے ایک دفعہ یہ کردیا تو مسلمانوں کو یہ بات آسانی سے سمجھائی جاسکتی ہے کہ ترقی (Progrees) کا تصور اسلام کے عین مطابق ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہم اپنی انفرادی زندگی میں اسلامیت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ دشمن کی یہ حکمت عملی ان شاءاللہ بالکل کامیاب نہیں ہوگی اور یقیناً ہم روشن خیال اور اعتدال پسندی کو شکست فاش دیں گے، یہ محض میری رائے نہیں ہے بلکہ ایک اٹل حقیقت ہے، اس لیے کہ مغرب آج ایک شکست خوردہ، پسماندہ، زوال پذیر اور نظام زندگی کی طرف دعوت دے رہا ہے، اور صرف وہ لوگ جو مغرب کو اچھی طرح سے نہیں جانتے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مغرب طاقتور ہے اور اس کے لیے ہمارا وہی رویہ مناسب ہے جو ہم نے انیسویں صدی میں اختیار کیا تھا، مغرب کے زوال کی تین ٹھوس دلیلیں ہیں جو ناقابل رد ہیں:

(۱) سب سے پہلے تو مغربی علمیت نے جو مفروضات قائم کیے تھے خود مغربی تہذیب کے اندر آج غالب رجحان ان کے رد کی طرف ہے، پس جدیدیت (Post modernism) کی تحریک نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ماڈرنزم نے جو دعوے کیے تھے وہ سب جھوٹے ہیں، لہٰذا علمی سطح پر ماڈرن ازم کو مغرب نے خود ہی رد کردیا ہے، مغرب نے یہ رد کردیا ہے کہ عقلی بنیادوں پر یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ آزادی، مساوات اور ترقی کسی طرح سے تہذیب کی صف بندی قائم کرنے کے لیے جائز بنیادیں ہوسکتی ہیں، لہٰذا جو نظام زندگی مغرب اس وقت ہمارے اوپر مسلط کیے ہوئے ہے محض جبر کی بنیاد پر ہے، کسی دوسرے طریقے سے وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کرسکتا، جہاں بھی جمہوریت آئی ہے اور آئے گی وہ امریکی شمشیر وسنان تلے ہی آئے گی، جہاں بھی جمہوریت کے نتیجہ میں دستوری ریاست قائم ہوگی وہ امریکی فوج کے تسلط کی بنیاد پر ہوگی، گویا اب مغربی تہذیب کا دنیا میں پھیلنا خصوصاً اسلامی ممالک میں امریکی قوت اور جبر کی بنیاد پر ہی ہے۔

(۲) مغربی تہذیب کا دوسرا المیہ یہ ہے کہ مغرب خود اس قابل نہیں رہا کہ اپنے عالمی نظام کو قائم رکھ سکے، اس وقت پوری دنیا کے اندر امریکیوں کی تعداد محض تین فیصد ہے، پورا مغرب دنیا کی کل آبادی کا محض چودہ فیصد ہے، ۲۰۵۰ء تک یہ آبادی محض نو فیصد رہ جائے گی، اس لیے کہ جو نظام زندگی انہوں نے اپنایا ہے اس سے وہ نسلی وقومی خودکشی کررہے ہیں، ابھی بیجنگ ٹائم میں ایک کارٹون چھپا ہے جس کے پنجرے میں چمپینزی تھے اور دوسرے پنجرے میں ایک

امریکی کو دکھایا گیا ہے اور ایک چینی اپنے بچوں سے کہہ رہا ہے دیکھو ایک سو سال پہلے یہ پوری دنیا پر حکمرانی کرتا تھا، یہ عددی زوال اس نظام زندگی کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے اور اس عددی زوال کو نہیں روکا جا سکتا جب تک کہ اس نظام کو بدلا نہ جائے، لہٰذا جو آئندہ صدی ہے لازماً امریکہ کے زوال کی صدی ہے۔

(۳) تیسری کمزوری وہ معاشی تضادات ہیں جس کی بنا پر نظام سرمایہ داری کو آگے بڑھانا ناممکن ہے، اس کی تفصیل کرائسز تھیوری (Crises theory) ہے، یہ تضادات ناقابل حل ہیں، کیونکہ جن بنیادوں پر فنانشل مارکیٹ میں قدر متعین ہو رہی ہے ان بنیادوں پر اس کا تعلق پروڈکشن سیکٹر کے معاشی عمل سے مستقل قائم رکھنا ناممکن بات ہے، اس لیے جو بھی معاشی پالیسیاں اختیار کی جا رہی ہیں وہ ناکام ہیں اور کسی وقت بھی بڑا کریش ہو سکتا ہے۔

گویا کہ عسکری صف بندی ایسی نہیں ہے کہ جو ناقابل شکست ہو، عراقی اور افغانی مجاہدین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مغرب کی عسکری برتری کے باوجود جہاد ممکن ہے اور اسے بزورِ شمشیر اپنا تسلط قائم رکھنا ممکن نہیں، اسی طرح علمی غلبہ بھی ناقابل تسخیر نہیں ہے اس لیے کہ علمی سطح پر تو خود وہ اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹ گئے ہیں، معاشی سطح پر بھی کوئی ایسی صف بندی موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور انٹرنیشنل فنانس کے تسلط کو برقرار رکھ سکیں اور چین نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کو چیلنج بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مغرب کے مقابلے میں ایک معذرت خواہانہ مرعوبانہ اور مدافعانہ حکمت عملی اختیار کریں، مجاہدین افغانستان، عراق اور فلسطین نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ استعمار کو شکست دینا ممکن ہے، اب استعمار کی بہت بڑی حکمت عملی یہ ہے کہ مجاہدین کو علماء کی سرپرستی سے محروم کر دے، اور علماء بات کرنے لگیں اعتدال پسندی کی، روشن خیالی کی اور مغربی دنیا سے ڈائیلاگ کی اور یہ کہنے لگیں کہ مجاہدین تو بے عقل اور بے وقوف ہیں، یہ اسلام کو ختم کرنے والے لوگ ہیں، یہ اسلام کے اصل نمائندے نہیں ہیں۔

یہ محض ان کی امیدیں ہیں اور یہ انیسویں صدی کے حالات نہیں کہ جب تحریکات اسلامی کو شکست ہو گئی، آج تو یہ چھوٹے سے ملک چیچنیا تک میں بھی ممکن نہیں جو آبادی اور رقبے کے لحاظ سے بہت کم ہے، عراق اور افغانستان تو بہت مشکل اہداف ہیں، میں حاکم بدہن یہ کہنا چاہوں گا کہ عراق میں ہمیں شکست ہو سکتی ہے لیکن وہ محض امریکی قوت کی وجہ سے نہیں بلکہ شیعہ و سنی جھگڑے کی وجہ سے ہو سکتی ہے، افغانستان میں بھی شکست کی وجہ یہی تھی کہ ایران کے ساتھ ہمارا رابطہ موجود نہیں تھا، شکست ہم کھا سکتے ہیں، لیکن دشمن سے نہیں بلکہ اپنے اندر سے، اس لیے استعمار چاہتا ہے کہ ہم آپس کی لڑائی کو جہاد سمجھنے لگیں اور اعتدال پسند روشن خیالوں کو اپنا حلیف سمجھنے لگیں، بریلوی اور دیوبندی آپس میں فروعات پر تو نزاع رکھیں لیکن روشن خیال اعتدال پسندوں کے نظام کے اندر رہ کر ان کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کریں، آج ہم اتحاد اور جہاد سے ہی روشن خیال اعتدال پسندی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

محمد دین جوہر
نامور سکالر مدیر سہ ماہی جی

ہمعصر الحاد پر ایک نظر

دنیا کے ہر مذہب میں خدا کے تعارف، اس کے اقرار، اس سے انسان کے تعلق اور اس تعلق کے حامل انسان کی خصوصیات کو مرکزیت حاصل ہے، مختصراً مذہب خدا کا تعارف اور بندگی کا سانچہ ہے، جدید عہد مذہب پر فکری یورش اور اس سے عملی روگردانی کا دور ہے، لیکن اگر مذہب سے حاصل ہونے والے تعارفِ خدا اور تصورِ خدا سے انکار بھی کر دیا جائے، تو فکری اور فلسفیانہ علوم میں خدا ایک عقلی مسئلے کے طور پر پھر بھی موجود رہتا ہے، خدا کے مذہبی تصور اور اس سے تعلق کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے جدیدیت نے اپنی ابتدائی تشکیل ہی میں ایک مجہول الہ (deity) کا تصور دیا تھا جس کی حیثیت ایک فکشن سے زیادہ نہیں تھی، جدیدیت نے آدمی کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ وہ اس مفروضہ خدا سے تعلق طے کرنے میں بھی آزاد ہے، جدیدیت نے خدا کے مذہبی تصور کا مکمل انکار کیا، لیکن ایک افسانوی اور عقل ساختہ خدا کا تصور پیش کر کے خدا پرستی اور آزادروی کا التباس باقی رکھا، اس طرح جدیدیت نے انسان کو مذہب سے لاتعلق ہونے کا راستہ اور جواز فراہم کیا، وقت گزرنے کے ساتھ صنعتی ترقی، صنعتی کلچر، جدید تعلیم، سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ، اور جدید سیاسی اور معاشی نظام نے اس سوال کو بالکل ہی غیر اہم بنا دیا، جدید دنیا میں مذہب کے مطابق خدا کو ماننے والوں کی حیثیت اب پسماندہ ذہن اور کلچر رکھنے والے ریڈ انڈینز کی طرح ہوگئی ہے۔

الحاد سے عام طور پر خدا کا انکار مراد لیا جاتا ہے، اور دہریت اس کی فکری تشکیلات اور تفصیلات پر مبنی ایک علمی مبحث اور تحریک ہے، آج کی دنیا میں الحاد فرد کی داخلیت میں مستحکم ہوگیا ہے اور دہریت ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہے، جو خدا کو ماننے کے مذہبی عقیدے اور غیر مذہبی رویے کے خلاف جارحانہ لائحہ عمل رکھتی ہے، الحاد اور دہریت اب کوئی علمی یا عقلی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ یہ ایک سماجی اور ثقافتی صورت حال بن گئی ہے، جس نے کہیں کہیں ایک تحریک کی شکل بھی اختیار کر لی ہے، اب دہریت اپنے پھیلاؤ اور دفاع کے لیے تحریکی ذرائع استعمال کر رہی ہے اور سیاسی طاقت اور سرمائے کی بڑی قوتیں اس کی پشت پر ہیں۔

دہریت کی تحریک میں شدت کی ایک بڑی وجہ اسلام ہے، مغربی تہذیب نے ترقی کے منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب کاری (ویسٹرنائزیشن) اور جدید کاری (ماڈرنائزیشن) کو عالمی سطح پر فروغ دیا، ان دوعوامل کے پیدا کردہ نئے سماجی اور ثقافتی حالات میں دنیا کے مذاہب بخارات کی طرح تحلیل ہو گئے، مسلم دنیا میں مغرب کاری اور جدید کاری کے منصوبوں کو جزوی کامیابی تو یقیناً ہوئی، لیکن وہ اسلام کی بیخ کنی کرنے میں نہ صرف ناکام رہے، بلکہ انہیں ہر سطح پر مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا، جو الحادی اور اباحتی مقاصد، معاشی ترقی، سیاسی پالیسی اور ثقافتی تبدیلی سے بالواسطہ حاصل نہ کیے جا سکے، دہریت کی تحریک اب انہیں جعلی علوم، سیاسی دھونس اور معاشی دباؤ سے براہ راست حاصل کرنا چاہتی ہے۔

الحاد کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ہماری ناقص رائے میں ان میں کم از کم تین اسباب اہم ہیں جن کو ہمارے کلچر اور معاشرے میں بھی زیر بحث لانا ضروری ہے، یہ اسباب (۱) عقلی، اور (۲) نفسی ہیں، اور یہ (۳) استعماری غلامی کے نتیجے میں بھی سامنے آئے ہیں۔

الحاد کے عقلی اسباب

اگر الحاد کا مرکز ذہن ہو تو اس کے اسباب عقلی ہوتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں الحاد کے اسباب علمی اور عقلی ہوں تو اس کا مرکز ذہن ہوتا ہے، عقلی الحاد کا شجرہ نسب براہ راست تحریک تنویر سے مل جاتا ہے، جدید عہد انسانی ذہن کی ایک نئی ساخت سے پیدا ہوا ہے اور اس نئی ساخت کو مسلسل صیقل کر کے یہ عہد خود کو تسلسل دیتا ہے، جدید ذہنی ساخت میں جاننے کو مرکزیت حاصل ہے اور ماننے کا عمل معیوب و مطرود ہے، جس طرح بیداری اور نیند انسانی شعور کا فطری اور معمول کا وظیفہ ہے، اسی طرح جاننا اور ماننا بھی انسانی شعور کا فطری معمول ہے، ماننے کی قیمت پر جاننے کی پرورش کرنا جدید انسان کے ساتھ خاص ہے، الحاد ایک جدید موقف کے طور پر اس نئی شعوری ساخت سے جنم لیتا ہے، انسانی شعور کی ساخت، اس کے دائرہ کار، اس کی فاعلیت اور انفعالیت کے نادرست تناظر اور علم کے بارے میں سرتاسر غلط موقف کا براہ راست نتیجہ الحاد اور دہریت کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

دراصل انسانی شعور کے بارے میں مجموعی طور پر غلط موقف ہی الحاد کی بنیاد میں کارفرما ہے، جدید شعور کا وحی اور امکان وحی سے ارادی انکار اس کی سرشت میں بہت پختہ ہو چکا ہے، اور جو تاریخی سفر میں فی نفسہ علم کے انکار کی صورت میں سامنے آیا ہے، امکانِ علم کے خاتمے کی صورت حال میں جدید انسان میں عقیدے کے خلاف ایک سماجی اور سیاسی شدت پیدا ہو گئی ہے، کسی بھی طرح کے مذہبی عقیدے یا نظریاتی موقف کی موجودگی جدید ذہن اور عقل کی المناک

نارسائی اور غیر معمولی ناکامی کا استعارہ بن گیا ہے، کیونکہ جدید ذہن انسان سے عقیدہ چھین کر اسے کوئی علم دینے کے قابل بھی نہیں ہو سکا، اس مشکل سے نکلنے کے لیے جدید ذہن انسان کو پوسٹ ہیومن ہونے کی تھپکیاں دے رہا ہے، پوسٹ ہیومن کا سادہ مطلب انسان کو یہ باور کرانا ہے کہ اسے پیاس تو بالکل بھی نہیں لگتی، بس برگر کی بھوک ہی لگتی ہے، پوسٹ ماڈرنزم کے احوال میں جدید انسانی شعور ملبے کا ڈھیر ہے، اور قرائن یہی بتا رہے ہیں کہ یہ دنیا کو بھی ملبے کا ڈھیر بنانے والا ہے، انسانی شعور کے فکری حاصلات اور علمی انتاجات تاریخی تحقق لازماً حاصل کرتے ہیں، اور جدید شعور کا یہ ملبہ تاریخی تحقق کی طرف تیز تر سفر میں ہے۔

جدید عقل وسائلِ شعور سے پوری طرح خود آگاہ ہے، اور جاننے کے عمل میں ان وسائل کا ناکافی ہونا اب عقل کے تجربے میں ہے، جدید عقل کو جس شئے کے جاننے کا مسئلہ درپیش ہے یعنی کائنات، وہ اس کے حسی ادراک، وقوفی گھیراؤ اور کمندِ فہم سے فزوں تر ہے، یعنی یہ کائنات اس کے تجربے اور ذہن دونوں کی سمائی سے زیادہ ہے، جدید انسان جاننے والے فاعل اور جانے گئے مفعول کی دوئی میں رہتے ہوئے علم کے قیام میں ناکام ہو چکا ہے، اور اب اس پیراڈائم سے دستبردار ہو گیا ہے، جدید انسان کا آخری سہارا اب وقوف اور فہم ہے اور اب وہ فہم کی تقدیس سے فاعل و مفعول کی دوئی اور ذہن و شئے کی ثنویت کو پاٹنے کی کوشش میں ہے، جس کا نتیجہ ایک شدید اور گہری موضوعیت کی صورت میں سامنے آ رہا ہے، جدید اور منہدم انسانی شعور خارج از ذہن کسی چیز کے امکانِ ادراک و علم ہی سے انکاری ہے۔

صرف جاننے کی پوزیشن پر کھڑے ہونے والے جدید شعور کا ایک بہت بڑا مسئلہ اقدار ہیں، خدا کو ماننے یا نہ ماننے کا موقف اپنی اصل میں دی گئی اقدار کو ماننے یا نہ ماننے کا مسئلہ ہے، اور خدا محض عنوان ہے، خدا کو ماننے کا معنیٰ علمی نہیں ہے، اقداری ہے، خدا کا انکار یک بیک اقدار کا انکار بھی ہے، وجود باری کے انکار سے پیدا ہونے والے احوال میں انفرادی اور سماجی سطح پر اہوائی پسند ناپسند انسان کی اخلاقیات بن جاتی ہے، جاننے کے عمل میں اگر خدا غیر اہم، غیر ممکن اور غیر موجود ہے تو اقدار بھی غیر اہم، غیر ممکن اور غیر موجود ہیں۔

خدا پر یقین اقدار ہی کی سربلندی ہے، اور اس یقین کا مطلب بہت سادہ ہے، خدا اور اقدار کو مان کر انسان یہ اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ نہ میں خود سے ہوں نہ خود کے لیے ہوں، اگر انسان اس غیر مذہبی اور فطری موقف کو مان لے کہ وہ نہ خود سے ہے، اور نہ خود کے لیے ہے، تو وہ ہدایت کا مخاطب بننے کی اہلیت سے متصف ہو جاتا ہے، جونہی انسان اس بات کا انکار کرتا ہے کہ وہ نہ خود سے ہے اور نہ خود کے لیے ہے، تو وہ اپنے انسان ہونے سے دستبردار ہو جاتا ہے، جدیدیت انسان کے عین اسی وجودی موقف کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور اسے ایک خود مختار و خود مکتفی وجود قرار دیتی ہے، اور اس کا انسان رہنا اور انسان ہونا ممکن نہیں رہتا۔

جاننا انسانی شعور کی فاعلیت ہے اور ماننا اس کی انفعالیت، اگر جاننا انسانی شعور کا واحد فعل قرار دے دیا جائے، اور ماننے کی انفعالیت سے انکار کر دیا جائے تو انسانی شعور کی اساس فہم پر منتقل ہو جاتی ہے، فہم اساس شعور بھی جدید ذہن ہی کی ایک قسم ہے، جو اپنے لب لباب میں مذہبی نہیں ہے، فہم جدید ڈوبتے شعور کو تنکے کا سہارا ہے، فہم کے غلبے میں انسانی شعور کی انفعالیت کا انکار آسان ہو جاتا ہے، اور اقدار کی قبولیت اور ان سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ فہمی شعور جلد یا بدیر اقدار سے منقطع ہو جاتا ہے، جاننے کا عمل اور فہم کی سرگرمی انسانی ذہن کو مکمل طور پر نیچرلائز کر دیتی ہے اور وہ مذہب کے ماورائی معانی کا مخاطب نہیں بن پاتا، اگر جاننے والے ذہن اور فہم میں نسبتیں گہری ہو جائیں تو ایسا شعور ایک ململی ردائے عقلی کی پٹی میں ملفوف ہو جاتا ہے جس میں خبرِ غیب بار نہیں پا سکتی، فہم کا بنیادی مقصد حیات ارضی میں موضوعیت اور معروضیت کی دوئی سے پیدا ہونے والی کھائی کو پاٹنا اور شعور کی سرگرمی کو بامعنی بنانا ہے، فہم کا تعلق تجربی موضوعیت اور شہودی معروضیت سے ہے، اور غیب سے غیر متعلق ہے، اس لیے فہم پر زور دینے والا مذہبی ذہن بھی دراصل جدید ذہن ہی کی ایک شکل ہے۔

خالص عقلی اور علمی بنیادوں پر الحاد تک پہنچنے والے ذہن اور افراد ہمارے ہاں بہت کم اور خال خال ہیں، کیونکہ الحادی علمی نتائج تک پہنچنے کے لیے ذہن کی آزاد فعلیت لازمی ہے، ہمارے ہاں تو فعلیت ہی نہیں ہے، آزاد فعلیت کیا ہوگی، لیکن بہرحال ایسے الحادی ذہن کو "انگیج" کیا جا سکتا ہے، اس کی بنیاد خدا کے موجود یا غیر موجود ہونے کے عقلی دلائل نہیں ہوں گے، بلکہ اس کی بنیاد انسانی شعور کی ساخت، اس کے مجموعی ادراکی اور علمی وسائل، شعور اور علم کا باہمی تعلق اور شعور کے داخلی اور فطری اقتضآت ہوں گے، اگر انسانی شعور کے کل وسائل کو حتمی تو کجا کافی بھی ثابت کیا جا سکے تو الحاد کا موقف قابل غور ہو سکتا ہے، ہماری گزارش ہے کہ علم کے حصول کے لیے انسانی شعور کے وسائل حتمی تو یقیناً نہیں ہیں ان کو کافی ثابت کرنا بھی ممکن نہیں، پھر جدید ذہن کے کارناموں کا اس کے اپنے قائم کردہ علمی تناظر میں تجزیہ بھی ضروری ہے، جدید ذہن اپنے انکاری علم، آلاتی اخلاقیات اور فطرت ارضی پر غلبے سے جس طرح کی دنیا تشکیل دے چکا ہے، وہ انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی، اور اس کے لیے پوسٹ ہیومن نامی ایک نئی آرگنزم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو حیوان اور مشین کا مجموعہ ہوگی، جدید ذہن اپنی ہی بنائی ہوئی جنت ارضی میں محصور ہو کر وسائل حیات کو بھی معرض خطر میں ڈال چکا ہے۔

جدید ذہن کے کارنامے اور کرتوت اس کے کھاتے میں رکھ کر ہی اس کے موقف کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے، ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہمیں جدید ذہن کے کارنامے تو ازبر ہیں، کرتوت معلوم نہیں، اس لیے بات شروع ہونے سے پہلے ہی دھونس میں آ جاتے ہیں، ہمارے ہاں روایتی عقلی علوم کے خاتمے اور جدید عقلی اور نظری علوم سے لاتعلقی کی وجہ

سے الحاد کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا ہے، جدید الحادی عقل کا سامنا جدید مذہبی عقل سے ہی کیا جا سکتا ہے، اور مذہبی مرادات پر جدید عقل کی نظری اور فکری تشکیل ہمارے ہاں نا معلوم ہے، افسوس تو یہ ہے کہ ہماری متداول مذہبی روایت عقل اور علم کی دشمنی کو مذہبی ذمہ داری کے طور پر فروغ دے رہی ہے، اور جدید الحادی عقل کے سامنے کھڑے ہونے کی داخلی کوششوں کو نہ صرف شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے، بلکہ ان کے خلاف صف آراء ہے، اس صورت حال میں جدید عقلی الحاد وباء کی طرح پھیل رہا ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

الحاد کے نفسی اسباب

اگر الحاد کے اسباب نفسی ہوں تو اس کا مرکز طبیعت ہوتی ہے، اور الحاد کے نفسی اسباب پر ہمارے ہاں گفتگو معدوم ہے، عقلی اسباب کی نسبت جدید عہد میں الحاد کے نفسی اسباب کی کثرت ہے، ان کا تجزیہ دقتِ نظر کا متقاضی ہے اور ان کا توڑ بھی زیادہ مشکل ہے، کیونکہ عقلی الحاد صرف ذہنی ہوتا ہے جبکہ نفسی الحاد وجودی ہے، نفسی الحاد کے وجودی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اور شعور کے احوال انکار پر ہوتے ہیں اور نفس کے احوال بغاوت پر ہوتے ہیں، اور ارادہ اہواء کے تابع ہوتا ہے، مناسب تیاری کے بغیر، مذہبی آدمی کے لیے انکار اور بغاوت کا بیک وقت سامنا کرنا مشکل ہے، الحاد کے نفسی احوال میں علم اور اقدار کا التباس بہت عام ہے کیونکہ یہ بنیادی طور پر ایک (سائیکک کنڈیشن) ہے۔

الحاد کے نفسی اسباب کا شجرہ نسب براہِ راست یوروپی رومانویت کی تحریک سے مل جاتا ہے، ہمارے ہاں رومانویت کی تحریک کے جو اثرات مرتب ہوئے، وہ کسی علمی اور فکری تجزیے کا موضوع نہ بن سکے، مغرب میں پیدا ہونے والی رومانوی تحریک کے اظہارات صرف ادب اور فنون وغیرہ تک محدود نہیں ہیں، مغربی رومانویت کے طاقتور ترین مظاہر یورپ کے سیاسی عمل میں سامنے آئے ہیں، تحریک تنویر سے جڑے ہوئے سیاسی عمل میں مرکزیت ریفارم کو حاصل تھی، جبکہ رومانویت سے جڑے ہوئے سیاسی عمل میں مرکزیت انقلاب کو حاصل ہے، ریفارم کے لیے عقل کی ضرورت پڑتی ہے، جبکہ انقلاب کے لیے منہ زور اور سینہ زور طبیعت اور بے دماغی کافی ہوتی ہے، تحریک تنویر ماضی اور روایت سے بنی ہوئی دنیا کو ریفارم کے عمل سے ختم کرنا چاہتی تھی، جبکہ رومانویت اس کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرتی اور انقلاب کے ایک ہی ریلے میں اسے مٹا دینا چاہتی تھی۔

اس تناظر میں دیکھیں تو ہم اپنے استعماری تجربے کی وجہ سے اس وقت ایک بہت بڑے تہذیبی تذبذب اور علمی اشکال میں پھنسے ہوئے ہیں، ہمارے ہاں مذہبی سیاست کی پوری شناخت، عمل اور طریق کار مغرب کی سیاسی رومانویت کا انتہائی گھٹیا چربہ ہے، جمہوریت، تنظیمی ریاست، قانون سازی، حقوق انسانی کے جدید تصورات، سیاسی

ریفارم، معاشی ترقی وغیرہ مغرب کی غیر رومانوی سیاسی فکر کے نتائج اور اس کا ایجنڈا ہیں، جبکہ انقلاب مغربی سیاسی رومانویت کا معبد اعظم ہے، ہمارے ہاں بھی مذہبی سیاست بنیادی طور پر تحریکی اور انقلابی نوعیت کی ہے، جو مکمل طور پر مغربی رومانویت کی نقالی ہے، ہمارے ہاں مذہبی سیاسی رومانویت نے تاریخی شعور، دینی روایت اور عقلی علوم کا بالکل صفایا کر دیا ہے، اور پوری دینی روایت کی عامیانہ فہم اور استعماری رومانوی جدیدیت پر تشکیل نو کی ہے جس نے دینی روایت کے تہذیبی تناظر کو بالکل فنا کر دیا ہے، ہمارے ہاں مذہبی بنیادوں پر جمہوریت کے خلاف سامنے آنے والے زیادہ تر مواقف سیاسی رومانویت سے حاصل ہوئے ہیں، ان کی بنیاد نہ استنادی ہے اور نہ عقلی اور ان کا مذہبی یا غیر مذہبی ہونا محض التباس ہے، رومانوی الاصل ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں مذہبی سیاست کا پورا مبحث اخلاقی بیانات کا مجرب مجموعہ، تاریخی شعور سے عاری اور سیاسی ادراک سے بالکل تہی ہے، مذہبی سیاسی کلچر میں پروان چڑھنے والی طبیعت الحاد کا تر نوالہ ہوتی ہے، رومانوی مذہبی تصورات پر کیے گئے سیاسی تجربے میں ناکامی کا غالب رجحان الحاد کی طرف پھر جاتا ہے۔

تحریک تنویر، مذہب اور خدا کے مذہبی تصور کے روبرو عقل کے موقفِ انکار کو سامنے لاتی ہے، رومانویت انکار نہیں ہے، تنویری عقل نے خدا کے انکار کے بعد خود خدا کی جگہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی اور یہ ابھی سکون سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے اپنے حرم میں بلوہ ہو گیا، رومانویت دراصل تنویری عقل کا انکار نہیں، اس کے خلاف بغاوت ہے، رومانویت مجسم بغاوت ہے جس میں انکار بائی ڈیفالٹ شامل ہے، رومانویت کی وجودی پوزیشن پر کھڑے ہو کر مذہب تو دور کی بات ہے عقل کا اثبات بھی ممکن نہیں ہوتا۔

رومانویت کسی عقل، دلیل، روایت، کسی اخلاقیات، کسی فلسفہ حیات، کسی تاریخ، کسی تقدیر وغیرہ کو نہیں مانتی، پس یہ اپنا راستہ چاہتی ہے، کیونکہ اس کے نزدیک ہونے کا سب سے بڑا اظہار غضب (wrath) ہے، رومانویت کی سرشت میں فناء گندھی ہوئی ہے اور یہ اپنی فناء سے پہلے انسان کو، اس کے معاشرے کو، تاریخ کو، فطرتِ ارضی کو، اور بس چلے تو پوری کائنات کے بخیے ادھیڑ کے ان کو اپنی مرضی کے مطابق نئے سرے سے بنانا چاہتی ہے، تاکہ اپنے نئے روپ میں یہ سب چیزیں اس کے سامنے سربسجود ہو جائیں، رومانویت نفس انسانی کی ایک ایسی نئی تشکیل ہے جس میں عبد و معبود یکجا ہے، یعنی رومانوی انسان کی تجلیل ذات ایسی ہے کہ وہ ساجد و مسجود خود ہی ہے، اور عظمت انسانی کے لیے شہید ہونا اس کی بنیادی رسومیات میں شامل ہے۔

رومانویت اپنا تحقق عمل پیہم میں حاصل کرتی ہے، جو سونامی صفت ارادے سے تحریک پاتا ہے اور آخر کار انقلاب پر منتہی ہوتا ہے، رومانویت وجودِ انسانی میں آئے ہوئے مستقل بھونچال کی طرح ہے اور یہ خود میں جل کر اور اپنے گرد و پیش کو جلا کر اپنا تحقق کرتی ہے، رومانویت کا چیزوں سے تعلق جاننے یا فہم وغیرہ کا نہیں ہے، بلکہ یہ تعلق براہِ

راست غلبے اور فناء کا ہے، عقل، مذہب، اخلاقیات، فلسفہ وغیرہ رومانوی ترتیب میں کوئی معنی نہیں رکھتے، رومانویت میں راستہ پہلے سے نہیں ہوتا، ارادے سے پیدا ہوتا ہے اور علم بھی ارادے سے پھوٹتا ہے، ادبی اور ثقافتی رومانویت نفسی خود مختاری کی علم بردار ہے، جبکہ سیاسی رومانویت انقلاب پسند ہوتی ہے، رومانوی تصورات پر تشکیل پانے والی انسانی شخصیت مذہب یا خدا کا انکار نہیں کرتی کیونکہ انکار بھی اسے اہمیت دینے کے مترادف ہے، عقلی الحاد ایک پہلے سے موجود اثبات کے روبرو انکار کا رویہ ہے، رومانویت اثبات و انکار ہی سے لاتعلق ہوتی ہے، عصر حاضر میں الحاد اور دہریت کا غالب سانچہ رومانویت ہے، جسے دنیا کو تبدیل کرنے کے عظیم الشان سائنسی اور سیاسی منصوبے کی پشتیبانی حاصل ہے۔ رومانوی آدمی فطرت اور تاریخ کے خلاف جنگ میں خود کو ایک بطل جلیل کے طور پر دیکھتا ہے اور مذہب وغیرہ کو خاطر میں لانا بھی کسر شان سمجھتا ہے۔

رومانوی الحاد کے نفسی اسباب میں ایک بہت بڑی وجہ فطری اخلاقیات کی مرکزیت ہے، یہ اخلاقیات بوقت ضرورت رومانوی ارادے کے لیے دستانے کا کام کرتی ہے، اور دیکھنے میں خوشنما، اپنی اصل میں آلاتی اور مذہب پر ضرب میں کاری ہوتی ہے، تحریک تنویر نے مذہب کے خاتمے اور اس کے تصورِ خدا سے نجات کے لیے ایک افسانوی الہ کا تصور عام کیا تھا، اور حق و باطل کے مذہبی تصورات ہی کا خاتمہ کر دیا تھا، رومانویت نے مذہب کو اخلاقیات کا ناقص مجموعہ قرار دیا اور اس کے مقابلے میں ایک فطری اور آفاقی اخلاقیات کا تصور دیا، تنویری عقل، عقلی تصورات کو مذہبی تصورِ خدا پر حکم سمجھتی ہے، رومانوی انسان فطری اخلاقی تصورات کو مذہبی تصورِ خدا پر حکم خیال کرتا ہے، دونوں کا مقصد مذہب اور مذہبی تصورِ خدا کو رد کرنا ہے، گزارش ہے کہ جدید علمی مواقف کی رسائی محدود ہے، اور وہ مذہب پر کاری ضرب لگانے کے باوجود اسے مکمل طور پر ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

لیکن جدید رومانوی اخلاقیات اپنے ہر ہر پہلو میں زیادہ مؤثر بھی ہے اور مسموم بھی، جدید انسان پر رومانوی اخلاقی شعور کا غلبہ انکاری علم سے زیادہ خطرناک ہے، اور مذہب اپنی جدید تعبیرات میں بہت تیزی سے اس کے سامنے ہتھیار ڈال رہا ہے، اخلاقی شعور درست اور غلط میں ظاہر ہوتا ہے، اور مذہب میں یہ شعور حق اور باطل کے تصور کے تابع ہے، اگر حق و باطل کا اساسی شعور باقی نہ رہے، اور اخلاقی شعور کا غلبہ ہو جائے تو دجل کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے، مذہبی شعور میں حق و باطل کا دائرہ مابعد الطبیعیاتی، تہذیبی اور تاریخی ہے، فطری اخلاقیات رومانوی شعور کی مابعد الطبیعیات ہے، رومانوی شعور نے اخلاقیات کو تہذیبی اور تاریخی دائروں تک وسعت دے کر مذہب کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ہے، اور الحاد ایک ثقافتی مظہر کے طور پر عام انسانی زندگی پر مؤثر ہو گیا ہے، رومانوی الحاد اور دہریت سے گفتگو کے لیے مذہبی آدمی کو نہایت تنگ اور محدود جگہ میسر ہے، جو ہمارے خیال میں یہ سوال ہے کہ انسان ہونے سے کیا مراد ہے؟

رومانوی دہریت میں فطری اخلاقیات ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ کے طور پر شامل ہے اور اس سوال کے ضمن میں رومانوی انسان کے نفسی احوال اور اس کی اخلاقیات کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔

الحاد کے عقلی اور نفسی اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک اعادہ ضروری ہے، عقلی الحاد کا سامنا کرنے کے لیے نظری علوم ضروری ہیں، تاکہ وسائل فراہم ہوں اور یہ بھی معلوم ہو کہ لڑائی کا میدان کہاں ہے، اب تو ہماری حالت یہ ہے کہ لڑائی کے لیے نکلتے ہیں اور سیدھے گھر کے تہہ خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے ہی نعروں اور ان کی گونج کو سن کر فاتحانہ لوٹتے ہیں، اسی طرح نفسی الحاد کا سامنا کرنے کے لیے عرفانی سلوک کی نئی ترتیب لازم ہے کیونکہ نفسی الحاد کا مقابلہ صرف عقلی علوم سے نہیں کیا جاسکتا، نفسی اور رومانوی الحاد میں ذہن اور طبیعت کو بیک وقت مخاطب کرنا ضروری ہے جس کا واحد ذریعہ عرفانی سلوک ہے، نظری علوم کے بغیر عقلی الحاد کا اور عرفانی سلوک کے بغیر نفسی الحاد کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ محض خام خیالی ہے، ہمارے ہاں جدید تعلیم اور دین کی جدید استعماری تعبیرات نے جس طرح عقلی الحاد کو فروغ دیا ہے، بعینہ ہمارے ثقافتی تصوف اور شعبدہ جاتی سلوک نے نفسی الحاد اور شرک کو وباء کی صورت دے دی ہے، اور ان کا تجزیہ اور تزکیہ لازم وملزوم ہیں، یہاں ضمناً ایک بات عرض کرنا ضروری ہے کہ رومانویت میں الحاد اور شرک کے امکانات یکساں موجود ہوتے ہیں، جدید عقل نے تو صرف شعور پر غلط موقف کو فروغ دیا ہے، جبکہ رومانویت شعور اور وجود دونوں کے بارے میں غلط موقف پر کھڑی ہوتی ہے، عرض ہے کہ جدید دنیا کے گھمسان میں سرمایہ ملت کی نگہبانی کا کام آج بھی درپیش ہے، اور ہم اس کی تیاری سے بالکل غافل ہیں۔

استعماری غلامی بطور منبع الحاد

غلامی ایک تاریخی ادارے کے طور پر یہاں زیر بحث نہیں ہے، جدید استعماری عہد میں غلامی اور محکومی میں فرق کرنا ضروری ہے، سیاسی طاقت سے مغلوبیت، محکومی ہے، اور محکومی کا شعور تاریخی اور سیاسی ادراک بن کر مزاحمت کا راستہ ہموار کرتا ہے، محکومی ایک سیاسی مظہر ہے، جبکہ غلامی ایک تہذیبی مظہر ہے، غلامی میں محکومی کا شعور باقی نہیں رہتا اور محکومی ایک مفید مطلب معروف کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، مزاحمت کی شرط اول محکوم کی تہذیبی شناخت کا باقی رہنا ہے، محکومی میں شناخت کے تہذیبی وسائل علمی روایت سے فراہم ہوتے ہیں، ان وسائل سے انقطاع غلامی کا بڑا سبب بنتا ہے، ایسی صورت حال میں محکوم حاکم سے شناخت کی عینیت پیدا کر کے غلامی میں داخل ہو جاتا ہے، حاضر وموجود سیاسی طاقت کا جبر محکوم میں تاریخی انقطاع کا باعث بنتا ہے اور تاریخ کسی ولولے کا منبع نہیں رہتی بلکہ ایک "گِلٹ" بن جاتی ہے، دینی روایت سے ملنے والے علمی شعور اور تاریخی شعور کا بیک وقت خاتمہ غلامی کا باعث بنتا ہے۔

اس میں اہم پہلو یہ ہے کہ انسانی معاشرہ جن اقدار پر قائم ہوتا ہے، سیاسی طاقت اس معاشرے کی شہر پناہ اور ان اقدار کی محافظ ہوتی ہے، سیاسی طاقت ختم ہوتے ہی بیرونی طاقت کے غلبے میں معاشرہ اقدار کے بحران کا شکار ہو جاتا ہے، اگر یہ بحران گہرا ہو تو محکوم معاشرہ بیرونی سیاسی طاقت سے تہذیبی عینیت پیدا کرنا شروع کرتا ہے، برصغیر میں مسلم معاشرہ استعماری دور میں اپنی تہذیبی شناخت اور ورلڈ ویو کو باقی نہیں رکھ سکا، اس وجہ سے مسلم ذہن تاریخی اور دینی روایت کے وسائل سے محروم ہو کر عصری تاریخ سے بھی کوئی بامعنی تعلق پیدا نہ کر سکا۔

عقیدے اور اقدار کا تاریخ اور معاشرے سے تعلق دو سطحوں پر ظاہر ہوتا ہے، ایک کردار میں اور دوسرے علم میں، کردار قدر اور تاریخ میں فاصلہ نہیں پیدا ہونے دیتا، اور علم ذہن کو تاریخ اور معاشرے سے حالت انکار میں جانے پر روک لگاتا ہے، ہمارے ہاں روایتی علوم کے خاتمے اور جدید علوم سے لاتعلقی نے ہمارے عقیدے اور اقدار کے پورے نظام کو متحجر بنا دیا ہے، عقیدے کی حفاظت بھی علوم کی زندہ روایت میں رہ کر ممکن ہوتی ہے، اقدار اگر تاریخ سے غیر متعلق ہو جائیں تو کلچر کے میوزیم میں داخل ہو جاتی ہیں، ان کو صرف کردار اور نظری علوم کے ذرائع سے ہی تاریخ سے متعلق رکھا جا سکتا ہے، دینداری کے مظاہر میں کمی اور نظری علوم کے خاتمے کی صورت حال میں جدید تعلیم نے الحاد کے راستے صاف کر دیے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہماری اقدار اور تاریخ میں فاصلہ بڑھ رہا ہے، اور ہماری دینی اقدار عصری دنیا کے لیے اجنبی ہوئی جاتی ہیں، جب اقدار اور تاریخ میں فاصلہ زیادہ ہو جائے تو اسے پاٹنے کے لیے ثقہ علوم اور کردار کی ضرورت شدید ہو جاتی ہے، ہمیں الحاد سے مقابلے کے لیے ان دونوں پہلوؤں پر غور کرنے اور لائحہ عمل ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

مولانا سہیل اختر قاسمی

اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کا کردار

دینی مدارس، اور اسلامی اداروں کا وجود افادیت کا حامل ہے یا مضرت کا؟ اس عنوان سے مکمل جہات کو محیط متعدد نظریات پیش کئے جا چکے ہیں، جو اپنی معتبریت، موزونیت کے اعتبار سے مکمل اور کامل ہیں، آج کا ہر رسالہ، اخبار ان سرناموں اور عنوانوں کی توضیح وتشریح کرتے ملتے ہیں کہ آیا موجودہ مدارس اپنے جلو میں امن کا کارواں رکھتا ہے یا فساد وتباہی کا آتش فشاں، اب تک مجموعی طور پر جو نظریات سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب مدارس اسلامیہ کی شبیہ کو متوازن، امن پسند اور قومیت پسند ماننے کی تعبیر ہیں۔

اپنے وضوح (clarity) اور ایمانداری کے باوجود دینی مدارس کے دامن پر، تشدد پسندوں کی جانب سے جو الزام (دینی مدارس دہشت گرد اور امن مخالف ادارے ہیں) لگا ہے وہ واقعی تناظر میں صرف ایک تہمت کی حیثیت رکھتا ہے دراصل مدرسہ مشن سے جس خاص طبقہ (اسلام مخالف طبقہ) کو تکدر اور انقباض ہے وہی مدرسہ مخالف کاز اور حرکات میں مساعد ومعاون ہوتا ہے، اس جہت سے اس کے افعال واعمال، مدارس مخالف ہی ہوتے ہیں، چونکہ نظریاتی سطح پر اس مفروضے کو تشہیر دی جاتی ہے اور اسے عوامی مقامات پر نمایاں کیا جاتا ہے جس سے ذہن سازی اور فکر سازی کی راہیں بھی ہموار ہو جاتی ہیں مگر تشہیر کا سہارا اسے ناقابل تکذیب سچ بنا دیتا ہے اور غالباً اسی منہج عمل نے مدارس اسلامیہ کے پرامن ہونے کے حوالے سے غور وفکر کی راہ کھول دی ہے اور یہ دعوت دی ہے کہ مدارس کی امن پسند شبیہ کو سامنے لایا جائے اور ان کی خدمات کو اس تناظر میں جانچا جائے تاکہ زہر زدہ فضاء میں مدارس کے کردار کو زہریلی ہواؤں سے محفوظ رکھا جا سکے، مدارس اسلامیہ کی خشت اول امن کے گارے سے تیار ہوتی ہے اور اس کے مقاصد واہداف میں سلامتی اور تحفظ کا سایہ فگن ہوتا ہے اس واقعیت کے باوجود یہ پروپیگنڈہ کہ مدارس اسلامیہ دہشت گردی کے اڈے اور انتہاپسندی کے مراکز ہیں، معروضیت مخالف ہیں۔

پوری دنیا میں جس مدرسہ کی بنیاد سب سے پہلے پڑی تھی وہ رحمۃ للعالمین کی زیر سرپرستی صفہ کے نام سے قائم ہوئی تھی، رحم جس کا کام، سلامتی جس کا اعلان اور تحفظ جس کا نظام تھا، اسی روشنی سے جلا پانے والے ہزاروں مدارس

دینیہ گزرے دور سے لے کرآج تک اسی اساس پر قائم ہیں برصغیر میں دینی مدارس بھی اسی نظام امن کے پیامبر اور محافظ ہیں، دینی مدارس کی بنیاد ہی امن وسلامتی کے عنوان سے بنتی ہے اوراس کی تشکیل بھی خیر وخوبی کے صدائے عام سے ہوتی ہے۔

اجتماعی اقدار کی تشکیل میں دینی مدارس کے بنیادی کردار سے انکار، ایک برملا حقیقت کا انکار ہوگا! جن بنیادوں پر ان کا قیام عمل میں آیا ہے اس کا نتیجہ اور ہدف صالح اقدار کی تشکیل وتعمیر ہے، ان مدارس کا پس منظر یا ان کی تگ ودو (Works) کا نتیجہ، بہترین علماء، صاحب کردار فضلاء اور انسانیت کے علمبردار، حاملین اسلام کی پیداواری اور معاشرہ کی برائیوں، قباحتوں اور داخلی شورشوں کا انسداد ہے، درحقیقت ان مدارس کا جو اساسی منشور اور بنیادی ہدف (Main target) ہے وہ ہے عالمی ضرورتوں کی اسلامی تکمیل، یہی وہ دائرہ ہے جس کے تحت سارے مدارس کا وجود عمل میں آیا ہے، گویا اپنے عمومی اور اساسی مفہوم میں مدارس دینیہ کی تاسیس عالمی ضرورتوں کی اسلامی تحصیل وتکمیل اور انسانی احتیاجوں کی بھرپائی ہے، یہی مدارس کا خاص ہدف ہے اور عام ہدف بھی، ان سے گریز، یا دامن کشی، اپنی اساس سے اعراض ہوگا، اور اگر ایسا ہے تو واقعی یہ المیہ اور نامسعود (Unfortunate) ہے، ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ، حقائق کا صحیح اور مناسب جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس اپنے اساسی منشور سے تھوڑے بہت گریزاں ہیں، یہ کوئی خواہ مخواہ کا قیاس اور رائے زنی نہیں، بلکہ موجودہ دینی اداروں کے اقدامات، رویوں اور عمل سے یہ بات معلوم ہوتی اور واقعی یہ بڑی تکلیف دہ ہے، اس حوالے سے دینی جامعات کو غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری دینی جامعات کی گریز پائی یا دامن کشی فقط یوں ہی نہیں، اس میں دینی مدارس کی جدید کاری کے عنوان سے چلنے والی تحریکات کے ردعمل کی نفسیات اور خوف کارفرما ہے اور شاید اس معاملہ میں مسلم علماء اور قدامت پسند ماہرین شرعیات کا عناد اور ہٹ دھرمی قابل معافی ہے کیونکہ وہ ردعمل کی نفسیات ہے، اگرچہ یہ ردعمل انتہا پسندانہ اور منفی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسے ردعمل سے مسلم امہ کا نقصان ہے، اس حوالے سے غور وفکر اور تدبر کے مظاہرہ کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بہرکیف ان نقائص (جو کہ کچھ خاص حالات کے پیداوار ہیں) کے باوجود دینی مدارس کی افادیت، تعمیری حیثیت، اخلاقی ساکھ، تشکیلی امیج اور بنیادی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، آج بھی وہ مشعل راہ ہیں، اسے اپنا کر، اقدار کی اصلاح کرسکتے ہیں، اخلاقیات کی اشاعت ہوسکتی ہے، تعلیم کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، ناخواندگی کا انسداد ہوسکتا ہے، برائیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے اور ہر طرح کی قباحتوں کو فنا کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔

درحقیقت دینی مدارس کا سارا نظام، عملہ طلبہ اور فاضلین جس کام اور مشن پر مامور ہیں وہ لا تفسدوا فی الارض کی تمثیل اطاعت پر مبنی ہے، اس کا بنیادی مشن ہی معاشرے میں امن وسلامتی کی اشاعت ہے، جس قرآن

وحدیث کی تعلیم ان مدارس میں ہوتی ہے اس کی خمیر ہی معاشرہ سازی اور انسانی نسل کی اصلاح وتعمیر ہے، مدارس دینیہ کے پورے مقاصد صرف اور صرف بنی نوع انسان کی اصلاح وتعمیر کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں، ان مدارس کا تعلیمی جائزہ یہ بتلاتا ہے کہ دنیا کا سب سے معتدل اور متوازن نصاب مدارس اسلامیہ میں رائج ہے جس نصاب میں تشدد، انتہاء پسندی اور غلو آمیزی کا درس نہیں ہوتا ہے بلکہ امن وسلامتی، اصلاح وتعمیر اور معاشرہ سازی کی تعلیم دی جاتی ہے، درحقیقت مدارس اسلامیہ کا نصاب وہ بہترین مشعل راہ ہے جس کی روشنی میں نصاب سازی اور ازسر نو تعلیمی نظام کی تخلیق پوری دنیا کو امن وسلامتی کی راہ پر لا کھڑا کرے گا، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سورج جیسے روشن حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے برتا جائے۔

الغرض مدارس اسلامیہ کا مکمل تعلیمی، تربیتی، اخلاقی، انتظامی، معاشی اور سماجی نظام اعتدال وتوازن کا مظہر ہے، اس کا ہر حصہ قابل اعتماد اور ہر شعبہ اعتدال وامن پسندی کا داعی ہے، مدارس کے صرف وبذل میں جس اعتدال کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، وہ اقتصاد وتوازن کا اعلی ترین مظہر ہے، جس میں عیاشی، عیش کوشی اور سامان عیش وطرب کی فراہمی کے لئے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا، بلکہ بنی نوع انسان کے لئے سامان درس ہوتا ہے، اس کا متوازن معاشی نظام ان تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کو یہ درس دیتا ہے کہ کھربوں اور کروڑوں روپے خرچ کرنے اور سامان تزئین کے بے پناہ استعمال کرنے کی وجہ سے آنے والے تعلیمی خرچ میں جو اچھال پیدا ہوا ہے اور جس طرح تعلیم کو مہنگا بنا کر پیش کیا گیا ہے جس کی بنا پر ہزاروں اور لاکھوں غریب بچوں کی دسترس سے تعلیمی حصول یابی دور ہوگئی ہے وہ افسوس ناک ہے کاش کہ یہ عیاشی اور دھما چوکڑی ختم کی جائے تاکہ غریب سے غریب بچہ تعلیمی اسلحہ سے لیس ہوسکے اور علوم وفنون کا حاصل کرنا آسان ہوسکے۔

مدارس دینیہ کا انتظامی نظام وقار وسنجیدگی اور عدل ومساوات کا بہترین نمونہ ہے اگر یہ نقوش ہماری ہم عصر، عصری یونیورسٹیاں اپنالیں تو طلباء کی جانب سے ہونے والے احتجاجات اور اس کے نقصان میں ہونے والے حرجوں سے محفوظ رہنا آسان ہوجائے گا، مدارس اسلامیہ کا اخلاقی نظام، اخلاق ومروت کے مظاہرہ کی دعوت دیتا ہے، سچ یہ ہے کہ طلباء علوم دینیہ کا حسن سلوک اور طرز معاشرت اتنا بلند اور ارفع ہے کہ اسے ہم سماوی رفعتوں سے تعبیر کرسکتے ہیں آج ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے ان نقوش کو اپنایا جائے اور ریگنگ کی انتہا پسندی جو کہ اخلاقی دہشت گردی کی ہی ایک نوع ہے، اسکا سد باب کیا جاسکے۔

الغرض دینی مدارس، سراپا امن وسلامتی ہیں اس کا کردار ماضی میں بھی صاف ستھرا اور روشن تھا آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا درحقیقت دینی مدارس، ایک ایسا مشعل ہیں جس کی روشنی میں امن کا شہر قائم کیا جاسکتا ہے اور پُر امن معاشرہ کی تکمیل ہوسکتی ہے آج اس کی ضرورت ہے اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اس ضرورت کو ضروری اور لازم سمجھا جائے۔

مفتی محمد سجاد الحجابی
دار العلوم نرشک، مردان

آپ مشکاۃ المصابیح اور اصول حدیث کیسے پڑھائیں؟

الحمد للّٰہ رب العلمین و الصلوۃ والسلام الأتمان الأملان علی سیدناومولانامحمد المبعوث لـلافة رحـمة لـلعالمین وعل اله وصحبه الطیبین الطاهرین ومن تبعهم بإحسان إلی یو م الدین وبعد:

درس نظامی کی داخل درس کتب میں دو کتابوں کو ایسی خصوصیت حاصل ہے جو دیگر کتابوں کو حاصل نہیں اور وہ یہ کہ عموماً استاد کے قلم سے متن ہوتا ہے اور ایک مایہ ناز شاگرد اس متن کی شرح یا حاشیہ تحریر کر لیتا ہے لیکن مشکاۃالمصابیح اور کنز الدقائق ان دونوں کی شروح خود مصنفین ہی کے اساتذہ نے لکھی ہیں، اور ایسا اقدام دراصل اپنے شاگرد کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

چنانچہ علم کلام، تفسیر، حدیث اور علم بلاغت کے امام علامہ طیبی جو اپنے زمانے کے نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت تھے نے اپنے شاگرد علامة خطیب العمری التبریزی کی کتاب مشکوٰۃالمصابیح کی مبسوط اور لاجواب شرح بنام الکـاشف عـن حـقـائق السنن دس ضخیم جلدوں میں لکھی، علامہ طیبی کا ایک اور بڑا کارنامہ وہ حاشیہ ہے جو فتـوح الـغیـب کے نام سے تفسیر کشاف کے لئے تحریر فرمایا، جو حال ہی میں وزارت اوقاف دبئی نے سترہ (۱۷) ضخیم جلدوں میں چھاپ دی۔

اسی طرح امام نسفی کی کـنـز الـدقـائق کی سب سے پہلی شرح ان کے استاذ گرامی امام فخر الدین عثمان بن علی زیلعی (متوفی ۷۴۳ھ) نے تبیین الحقائق کے نام سے سات جلدوں میں لکھی، جیسا کہ مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ کے ملفوظات میں درج ہے، افادہ کیلئے یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ زیلعی کی نسبت سے دو بڑے علماء مشہور ہوئے، ایک تو یہی شارح کنز الدقائق، اور دوسرے ان کے بھانجے اور شاگرد عـلامة جـمـال الدین محمد بن یوسف الزیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) جو امام زین الدین عراقی کے شاگرد اور علامة نور الدین الهیثمی کے شریک درس

تھے، علامة الهيثمي نے امام زین الدین عراقی کی چھپن سال پرمحیط طویل شاگردی کی، نصب الراية في تخريج احاديث الهداية علامہ جمال الدین زیلعی کا بڑا کارنامہ ہے، بہرحال علامہ ابن نجیم جب بھی البحر الرائق شرح كنز الدقائق میں قال الشارح کا ذکر کرتے ہیں، تو مراد امام فخر الدین زیلعی صاحب تبيين الحقائق ہی ہوتے ہیں۔

مشكاة المصابيح دراصل امام بغوی کی کتاب المصابيح کی شرح اور تتمہ ہے، امام بغوی کی کتاب المصابيح کے کئی ائمہ علماءِ محدثین نے شروح لکھی ہیں، جیسے تورپشتی حنفی کی الميسر على مصابيح السنة بیضاوی کی تحفة الابرار ابن ملك الحنفي کی شرح المصابيح اور المظهري الحنفي کی المفاتيح شرح المصابيح وغیرہ جو سب کی سب طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں لیکن خطيب العمري کی مشكاة المصابيح کو جو مقام شہرت حاصل ہوا، وہ دوسری شروح کے حصے میں نہیں آئی۔

برصغیر میں مشكوة المصابيح کا درس صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور علماء حنفیہ اس کے احادیث کو پوری ذوق وشوق سے بڑی بسط وتفصیل اور تنقید وتشریح کے ساتھ پڑھاتے ہیں، درس نظامی کے متعلق عام طور پر یہ اشکال پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے کئی داخل درس کتابیں علماء شافعیہ کی تصنیف کردہ ہیں جیسے مشكوٰة المصابيح خطيب العمري الشافعي کی اور شرح نخبة الفكر حافظ ابن حجر العسقلاني الشافعي وغیرہ شافعیہ علماء نے لکھی ہیں، جبکہ برِصغیر میں تو اکثر رائج مذہبِ حنفی ہے اور ان کو دیکھ کر حنفی علماء محدثین ہی کی کتابوں کو داخل درس کیے جانا چاہیے تھا۔

لیکن اس اشکال کے کئی توجیہات کے باوجود ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ جو علماء مشكاة وغیرہ کا درس دیتے ہیں تو وہ مستدلاتِ شافعیہ کے اوپر تنقیدی اور تحقیقی نظر ڈالتے ہیں اور وہ باہر سے مذہب حنفی کی تائید کے لیے محققانہ انداز میں دوسرے دلائل، فاضلانہ طریقے سے ذکر کرتے ہیں، تاکہ طالبعلم میں تنقیدی اور تحقیقی صلاحیت ابھر آئے۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ جو فاضل مثلاً مشكاة المصابيح کا درس دیتا ہے انہیں چاہیے کہ مشكاة المصابيح کے حنفی علماء کے شروح کا گہری نظر سے مطالعہ کرلیا کرے جیسے علامہ عبدالحق محدث دہلوی کی لمعات التنقيح شرح مشكاة المصابيح ملا علی قاری کی مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی هداية الرواة الى تخريج احاديث المشكاة ان کے ساتھ ساتھ دیگر مستدلاتِ حنفیہ کو بھی مطالعہ میں رکھے۔

اس حوالے سے علامہ محدث عبدالباری لکھنوی نے اپنے کتاب التعليق المختار على كتاب الاثار کے مقدمہ میں ان کتابوں کی نشاندہی فرمائی ہے کہ جس کا ایک حنفی مدرس کے لیے مطالعہ کرنا اور پڑھنا ضروری ہے، راقم الحروف کچھ زیادات کے ساتھ نمبروار انہیں تحریر کرتا ہے۔

☆ مؤطا الامام مالك برواية الامام محمد بن حسن الشيباني: جو امام شافعی رحمہ اللہ

کے نزدیک أصح الكتب بعد كتاب الله ہے بلکہ اس کو شروح سمیت پڑھنا مناسب ہے جیسے علامہ کماخی کی شرح المهيا شرح المؤطا اور ملاعلی قاری کی شرح مشكلات المؤطا اور علامہ عبدالحیٔ لکھنوی کی التعليق الممجد وغیرہ۔

☆ مسند الاما م ابی حنیفه رحمه الله برواية الامام محمد المشهور بكتاب الاثار :جس میں اکثر احادیث اس اصح المسانید کے ساتھ مروی ہیں عن حماد بن سليمان عن ابراهيم النخعي عن اصحاب عبدالله بن مسعودعن ابن مسعودرضی الله عنه یہ بھی یادرہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تقریباً ان ایک ہزار روایات کا انتخاب چالیس ہزار احادیث وآثار سے کیا ہے، اور جیسا کہ حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی نے پوری تحقیق کی ہے کہ صحاح ستہ سے کتاب الآثار کا درجہ کم نہیں، بلکہ برابر ہے۔

☆ كتاب الحجة على اهل المدينة: تصنیف امام محمد رحمہ اللہ، جس میں مؤلف علام نے اہل مدینہ وامام مالک، اہل عراق وامام ابوحنیفہ کے درمیان مقارنہ ومحاکمہ کیا ہے، یہ کتاب پہلے حیدرآباددکن سے اوراب لبنان، بیروت سے مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مھدی حسن شاہ جہان پوری کی تحقیق وحواشی کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔

☆ جامع المسانيد: جس میں امام خوارزمی نے امام ابوحنیفہ کے مسانید کوایک ساتھ جمع کیا ہے، امام صاحب کے مسانید ایک روایت کے مطابق ۲۹، دوسری کے مطابق ۲۱، اور تیسری کے مطابق ۱۷ ہیں۔

☆ شرح معانی الآثار للامام الحافظ الحجة النقادالمحدث البصير ابی جعفرالطحاوی(۲۳۹ --- ۳۲۱ ھ) نے چار ضخیم جلدوں میں تصنیف فرمائی، اور حال ہی میں ۱۹ جلدوں میں امام بدرالدین العینی کی شرح نخبة الافكار فی تنقيح معانی الآثار بڑے آب تاب سے شائع ہوگئی ہے۔

☆ شرح مشكل الآثار للامام ابی جعفر الطحاوی رحمه الله :جو احادیث کے درمیان تطبیقات کے مناسبت سے ایک لاجواب کتاب ہے اور الشيخ شعيب الارنؤوط کی تحقیق کے ساتھ بیروت "مؤسسۃ الرسالۃ " سے سولہ جلدوں میں طبع ہوگئی ہے۔

بندہ عاجز راقم عرض کرتا ہے کہ ان کتابوں کے ساتھ ساتھ مزید یہ کتابیں بھی زیر مطالعہ رہنی چاہئے۔

☆ زُجاجة المصابيح : جو حنفی متدلات میں ایک مفید اضافہ ہے ابوالحسنات علامه عبد الله حيدرآبادی رحمه الله (۱۲۹۲---۱۳۸۴ھ) کے قلم سے ہے، جو ابھی حال ہی

میں مکتبۃ البشری سے چار جلدوں میں شائع ہوگئی ہے، اگر چہ فی الحال بدون تحقیق ہی سہی، لیکن طبع ہوگئی ہے۔

☆ اعلاء السنن: جو ۲۲ جلدوں پر مشتمل علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کے قلم سے دلائل حنفیہ کا ایک نایاب ذخیرہ اور مفید تر اضافہ ہے۔

☆ النکت الطریفة فی ردود ابن ابی شیبه علی ابی حنیفه للامام الکوثری: جو حال ہی میں فضیلة العلامة الدکتور حمزه وسیم البکری الاردنی کی شاندار تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں دار الفتح اردن سے شائع ہوگئی ہے، اُحادیث اُحکام کے سلسلے میں ایک بہترین تالیف ہے، بلکہ کیا ہی مناسب ہوگا اگر ملک کے تخصصات فی الافتاء کے نصاب میں یہ کتاب درساً داخل کی جائے۔

☆ نصب الرایة فی تخریج احادیث الهدایة للامام الزیلعی: جو علامہ عبد العزیز الفنجابی کے حاشیہ اور شیخ محمد عوامہ کے تقدیم اور تحقیق کے ساتھ شائع ہوگئی ہے۔

☆ تخریج احادیث الاختیار للامام قاسم بن قطلوبغا الحنفی: جو مصر سے چار جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔

☆ المواهب اللطیفة شرح مسند الامام ابی حنیفه للامام عابد السندی: جو حال ہی میں ڈاکٹر تقی الدین ندوی کی تحقیق کے زیور سے آراستہ ہوکر طبع ہوچکی ہے۔

☆ تنسیق النظام شرح مسند الامام: جو علامہ حسن سنبھلی کے قلم سے ہے، اور ڈاکٹر ولی الدین ندوی کی تحقیق سے زیر طبع ہے۔

☆ عقود الجواهر المنیفة فی ادلة الامام ابی حنیفه رحمه الله للامام مرتضی زبِیدی: حنفی مستدلات میں مفید کتاب ہے۔

☆ معارف السنن: جو علامہ یوسف بنوری کی ادیبانہ، محدثانہ اور تحقیقی کاوش ہے۔

ان سب کے ساتھ ضروری ہے کہ صحاح ستة، سنن دارمی، مصنف ابن ابی شیبه، مصنف عبدالرزاق الصنعانی، طبرانی کے معاجم ثلاثه، سنن دارقطنی، جامع الاصول لابن الاثیر کو مطالعہ میں رکھے، البتہ ان سب کا دیکھنا تو ایک مدرس کے لئے بیک وقت مشکل ہے لیکن ان میں سے بعض کا مطالعہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

یہ تو حدیث و شروح حدیث کی کتابوں کے بارے میں کچھ گزارشات تھیں۔

اصول حدیث میں ہمارے یہاں شرح نخبة الفکر اور تدریب الراوی پڑھائی جاتی ہیں، لیکن ان کتابوں میں اصول وقواعد اکثر شافعیہ کے طرز پر تحریر کی گئی ہیں، ایک حنفی مدرس کو ان کتابوں کا درس، روایتی انداز میں نہیں، بلکہ پورے تحقیق وتدقیق سے دینا چاہیے۔

تدریب الراوی للسیوطی کے بارے میں راقم کہے گا کہ اس نسخے کا مطالعہ کیا جائے جس پر حال ہی میں علامہ محقق، نقاد محدث شیخ محمد عوامہ کی تحقیق وشرح چھپ کر آگئی ہے، چونکہ شیخ عوامہ ایک مایہ ناز محدث ہے اور خود فرمایا ہے کہ "میں نے اس کتاب کی حواشی میں اپنے ساٹھ سالہ تجربے کا نچوڑ رکھ دیا ہے" اور یقیناً بجا فرمایا ہے، الحمد للہ یہ نسخہ بھی ۵ ضخیم جلدوں میں طبع ہوگیا ہے۔

یہ بات ذرا واضح کرتا جاؤں کہ مذہب حنفی کے اصول حدیث اکثر ہمارے اصول فقہ کی کتابوں کے مبحث السنة میں مندرج ہیں، لہٰذا ان سے اعتناء نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ ایک حنفی محدث اصول حدیث پڑھاتے ہوئے درج ذیل کتابوں کا بھی مطالعہ واجب سمجھ کر کرلے تو بڑے عمدہ فوائد حاصل ہوں گے:

(۱) الفصول فی الاصول (مبحث السنة) :للامام الکبیر ابی بکر الجصاص رحمہ اللّٰہ (۳۰۵---۳۷۰ھ) جو اپنے زمانے کے امام الاصول، الحجة، الفقیہ المجتہد کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

(۲) تقویم الادلة (مبحث السنة) للامام ابی زید الدبوسی رحمہ اللّٰہ (۳۶۹---۴۳۲ھ)۔

(۳) کنز الوصول الی علم الاصول (مبحث السنة) للامام فخر الاسلام البزدوی رحمہ اللہ (۴۰۰---۴۸۲ھ)، اور اس کتاب کو مندرجہ ذیل شروح کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے:

☆ الشامل شرح اصول البزدوی ،للامام الاتقانی

☆ الکافی شرح اصو ل البزدوی ،للامام السغناقی

☆ التقریر شرح اصول البزدوی للام البزدوی

☆ کشف الاسرار شرح اصول البزدوی للامام عبد العزیز البخاری

(۴) اصول السرخسی (مبحث السنة) للامام محمد بن احمد السرخسی (المتوفی ٤٨٢ ھ)

یہ کتابیں ائمہ حنفیہ کے وہ بنیادی مصادر ہیں جن میں اصولِ حدیث کا وافر ذخیرہ درج ہے، بعد کے علماء جیسے امام ابن الهمام،فقيه أسمندى، علاء الدين سمر قندى،ابن نجيم صاحب فتح الغفار شرح المنار ، ملا جیون وغیرہم نے بھی انہی کو اصل مان کر تشریحات وتفریعات کی ہیں۔

عصر حاضر میں اصول الحديث على منهج الحنفية پر ہمارے فاضل دوست الشيخ عبد المجيد التركماني الايراني کی تصنیف حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے جس کا نام دراسات في اصول الحديث على منهج الحنفية ہے، یہ اصولِ حدیث کے سابقہ تمام کتابوں کا ایک اچھا اور مفید نچوڑ ہے، اصولِ حدیث کے ایک استاذ کے لئے اس کا مطالعہ کرنا بھی ناگزیر ہے۔

ہمارے مشائخ اور اکابر واساتذہ کرام نے مشكوة المصابيح پڑھانے کے وقت انہی مفید مصادر ومراجع کو سامنے رکھ کر درس دیا ہے، مشكوة المصابيح کے اسی درسی انداز کے کئی شروح آج کل متداول ہیں، انہی میں سے ایک مفید شرح ہمارے شیخ كامل ولى الله، ماهر علوم وفنون، صدر المدرسين، فخر العلماء، مَجد الفضلاء والمحققين ،حامل لواء الشريعة وناشره بفهمه الثاقب النفيس، لسان المتكلمين، قدوة المناطقة، الفهامة الأمثل، المدرس الأفضل ، مكمل الفنون الأدبية، مفيد الفروع والأصول، ناهج مناهج المعقول والمنقول، العلامة المحدث الشيخ مغفور الله دامت بركاتهم، و لازالت طلعته الباقرة مطلعا لشموس السعادة ،ولابرحت ابوابه مورِداً لأصناف الكرامات ،وأعتابه مصدراً لأنواع المعاني والكمالات کی شرح بنام القول النجيح لحل ما في مشكاة المصابيح ہے جس کے اندر حدیث کی فاضلانہ تشریح میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، چنانچہ اس شرح میں حضرت دامت برکاتہم نے ہر حدیث کی تفسیری، حدیثی، اصولی، کلامی، بلاغی، نحوی، صرفی اور منطقی وغیرہ تشریحات پورے بسط وتفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہیں اور اگر کوئی ان تشریحات کو پڑھے گا تو حق یہ ہے کہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا پرتو نظر آئیگا۔

طوالتِ بحث کے تھکاوٹ سے بچنے کیلئے گاہ بگاہ مفید عنوانات قائم فرمائے ہیں، ہر حدیث کی تشریح میں بحث عمومی اور بحث خصوصی نے تحقیقی ذوق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے، احادیث میں حضرت شیخ اپنے استاذ جلیل، امام الكلام والفلسفة، الشیخ مارتو نگ بابا کی توجیہ جب پیش فرماتے ہیں تو قاری اس تحقیق انیق پر داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض یہ شرح کتاب سے متعلق ہر قسم مبحث کا ایک جامع ترین مظہر، اور حضرات مدرسین کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے، اہل ذوق، حضرت الشیخ اور ان کے عالی قدر اساتذہ واصحاب السند کے نفساتِ قدسیہ کو ہر صفحہ پر پائیں گے، حضرت شیخ کی علوِ سند کی مناسبت سے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ ان کی سند موجودہ دورہ میں

نہایت اونچی شمار کی جاتی ہے، جس سے کم ہی لوگ واقف ہیں، اور وہ سند یہ ہے:

عن الشيخ المحدث العلامة مولانا مغفور اللّٰه حفظه اللّٰه عن الشيخ المحدث الامام خان بهادر المدعو ب"مار تونگ بابا" عن الشيخ المحدث عبد الرحمن الامروهى عن الشيخ المحدث الصوفى الكامل فضل الرحمن گنج مراد آبادى عن الشيخ المحدث الشاه عبد العزيز المحدث الدهلوى عن ريحان الهند الامام الشاه ولى الله رحمه الله

اس سند کی مزید تفصیل کے لئے حضرت مفتی عاشق الٰہی بلندشہری کی ثبت العناقيد الغالية فى الاسانيد العالية ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس وقت القول النجيح کی دوسری جلد بھی منظر عام پر آئی ہے تشنگان علوم نبوت خصوصاً طلبائے علم حدیث وافر مقدار میں اس سے مستفید ہو رہے ہیں، ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالی حضرت الشیخ دامت برکاتہم کی زندگی میں برکت عطا فرما کر اسی آب وتاب کے ساتھ ان کو اس عظیم الشان شرح کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا عبدالرؤف بادشاہ

مدیر مسؤل

زندگی کے مختلف شعبوں پر حرام مال کے برے اثرات

تمہید

اسلام نے رزقِ حلال اختیار کرنے اور پاکیزہ غذا کھانے پر زور دیا ہے، اِس لیے کہ غذا کا اثر انسان کے قلب اور دماغ پر پڑتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُم عَدُوٌّ مُبِينٌ (البقرة :٦٨)

اے لوگوں! زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارے لیے ایک کھلا دشمن ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعمَلُونَ عَلِيمٌ (المؤمنون: ٥١)

اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزوں میں سے جو چاہو کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، مجھے اس کا پورا پورا علم ہے۔

یہ دونوں آیتیں حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کے بارے میں ہیں، پہلی آیت میں عام لوگوں کو اور دوسری آیت میں انبیا علیہم السلام کو حلال کھانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

رزق حلال کمانے کی ترغیب اور حرام سے ممانعت

اسلام نے حلال کمانے اور کھانے کی ترغیب دی ہے، اور حرام کی تمام صورتوں سے منع فرمایا ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے مختلف آیتوں میں صراحت کے ساتھ حرام چیزیں، حرام کمائی کی صورتیں، مال لینے کے غلط طریقے بیان کی ہے، قرآن کریم نے حرام کی ایک لمبی فہرست ذکر کی ہے، جیسے مردار، خون، خنزیر کا گوشت، غیر اللہ کے نام پر ذبح کی

ہوئی چیزیں،شراب، جوا،سود،غصب، رشوت، یتیم کا مال اور چوری کا مال،اسلام سے پہلے حلال اور حرام کی کوئی تمیزنہیں تھی،لوگ اپنی پسند کی چیزیں کھانے اور استعمال کرنے کے عادی تھے،اور ناپسند چیزوں کو چھوڑتے تھے،اسلام نے حلال اور حرام کے ایک ضابطہ اخلاق بنا دیا،امام ابوداؤدا پنی ''سنن'' میں ایک روایت نقل کرتے ہیں:

كان أهل الجاهلية يأكلون أشياء ويتركون أشياء تقذرا فبعث الله تعالى نبيه صلى الله عليه وسلم وأنزل كتابه وأحل حلاله وحرم حرامه فما أحل فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سكت عنه فهو عفو (سنن ابى داؤد، ح ٣٨٠٠:)

زمانہ جاہلیت میں لوگ کچھ چیزیں کھاتے تھے،اور کچھ گندگی کی وجہ سے چھوڑ دیتے تھے۔پھر اللہ تعالی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا،اپنی کتاب نازل کی،حلال کو حلال کیا اور حرام کو حرام۔تو جو اللہ تعالی نے حلال کیے وہ حلال ہیں،اور جو حرام کیے وہ حرام ہیں،اور جن کا تذکرہ نہیں کیا،وہ معاف ہیں۔

اِن تمام نصوص یہ بات معلوم ہوتی ہے،کہ اسلام نے حلال اور حرام کے درمیان مستقل حد بندی کی ہے،اور یہ بات مسلم ہے،کہ قرآن اور حدیث نے جن چیزوں کی حرمت یاان پر عذاب کا تذکرہ بیان کیا ہو،وہ گناہِ کبیرہ ہیں،اوران معاصی کے ارتکاب سے انسان کی روحانیت اور عبادات کو نقصان پہنچتا ہے،یہاں حرام مال کے چند نقصانات کا تذکرہ کیا جاتا ہیں۔

عقائد پر مال حرام کے اثرات

حرام مال کا ارتکاب اگر اِس عقیدے سے ہوں، کہ یہ حلال ہے،تو یہ صراحۃً کفر ہے، علامہ تفتازانی شرح العقائد میں کبیرہ گناہ کے بحث میں لکھتے ہیں

ومجرد الإقدام على الكبيرة لغلبة شهوة أو حمية او أنفة أو كسل خصوصا إذا اقترن به خوف العقاب ورجائالعفو والعزم على التوبة لا ينافيه۔ نعم إذا كان بطريق الاستحلال والاستخفاف كان كفرا لكونه علامة للتكذيب (شرح العقائد النسفية،البشریٰ كراتشى ص٢٦٥)

غلبہ شہوت، غیرت،ننگ وعار یا سستی کی وجہ سے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنا تصدیقِ ایمانی کے منافی نہیں ہے، جب اِس کے ساتھ عذاب کا خوف اور معافی کی امید دامن گیر ہو،ہاں اگر گناہ کو حلال سمجھ کر یا ہلکا سمجھ کر ارتکاب کیا ہو،تو یہ کفر ہے،اِس لیے کہ یہ تکذیب کی علامت ہے۔

علامہ کی اِس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی، کہ مالِ حرام کو حلال سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب کرنا کفر ہے، لیکن اگر حرام کو حرام سمجھ کر کر رہا ہو،تو پھر بھی ایمان کے کمال اور نورانیت کو نقصان پہنچا تا ہے ۔

عبادات پر مالِ حرام کے اثرات

اِس میں کوئی شک نہیں، کہ اللہ تعالی ان اعمال اور اقوال کو قبول کرتا ہے، جو خالص اس کی رضا کے لیے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق کیے جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

فَمَن كَانَ يَرجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَليَعمَل عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشرِك بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (الكهف: ١١٠)

لہذا جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے، اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھرائے۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے

إِلَيهِ يَصعَدُ الكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالعَمَلُ الصَّالِحُ يَرفَعُهُ (الفاطر: ١٠)

پاکیزہ کلمہ اسی کی طرف چڑھتا ہے، اور نیک عمل اس کو اوپر اٹھاتا ہے۔

اور عبادت کی قبولیت اور عدم قبولیت سے مراد

☆ اللہ تعالی کا کسی عمل پر راضی ہونا۔
☆ اس کے کرنے والے کی تعریف کرنا۔
☆ فرشتوں کے سامنے عمل کرنے والے پر فخر کرنا۔
☆ عمل پر اجر وثواب ملنا۔
☆ ذمہ سے فرض ساقط ہونا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ بندے نے اعمال وعبادات خالص اللہ تعالی کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ادا کئے ہو، تاہم اگر عمل کرنے والے کا کھانا، پینا اور لباس حرام ہوں، تو اس کے ذمہ سے فرض تو ساقط ہوجاتا ہے، لیکن اس کا یہ عمل بارگاہ ایزدی میں مقبول نہیں ہوتا، گویا حرام کے ارتکاب کرنے والے کو اعمالِ صالحہ پر نہ اللہ تعالی کی رضا نصیب ہوتی ہے، اور نہ اسے اجر وثواب ملتا ہے، اللہ تعالی کے اِس قول کا یہی مطلب ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ المُتَّقِينَ (المائدة :٢٧)

اللہ تو ان لوگوں سے (قربانی) قبول کرتا ہے، جو متقی ہوں۔

امام احمد ابن حنبل سے "المتقین" کا معنی پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا:

يتقى الأشياء فلا يقع فيما لا يحل له (جامع العلوم والحكم، ج١ ص٢٦٢)

متقی وہ ہے، جو ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہو، جو اس کے لیے حلال نہ ہوں۔

علامہ ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں:

خمس خصال بها تمام العمل: الإيمان بمعرفة الله عز وجل ومعرفة الحق وإخلاص العمل لله والعمل على السنة وأكل الحلال فإن فقدت واحدة لم يرتفع العمل (جامع العلوم والحكم، ج١ ص٢٦٢)

پانچ خصلتوں سے عمل مکمل اور قبول ہوتی ہے: اللہ تعالی پر ایمان، حق راستہ پہچاننا، عمل خالص اللہ تعالی کے لیے کرنا، سنت کے مطابق کرنا اور حلال کھانا۔ اگر اِن میں سے ایک بھی نہ ہو، تو عمل قبول ہی نہیں ہوتی۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے، کہ عبادات سے مراد دعا، صدقہ، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، قربانی اور نذر وغیرہ ہیں، اِن تمام چیزوں میں سے کوئی چیز بھی حلال مال کے بغیر قبول نہیں ہوتی، دعا کے عدمِ قبولیت کے بارے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک آدمی اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا مانگتا ہے، کہ اے رب، اے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور اس کی پرورش حرام سے، تو اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟ (المسلم، ح: ١٠١٥)

حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے کسی نے پوچھا: کیا وجہ ہے، کہ آپ کی دعائیں بہت زیادہ قبول ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: "میرے منہ میں جو لقمہ بھی جاتا ہے، مجھے اس کا علم ہوتا ہے، کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ (جامع العلوم والحكم، ج١ ص١٠١)

صدقہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا يقبل الله صلاة بغير طهور ولا صدقة من غلول (الترمذی، ح: ١)

بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں ہوتی، اور چوری کے مال سے صدقہ قبول نہیں ہوتا۔

آخرت کی جزا اور سزا پر مال حرام کے اثرات

اِس میں کوئی شک نہیں، کہ مالِ حرام کا کمانا عام طور پر ظلماً ہوتا ہے، اِس کے حصول میں دوسروں کا حق غصب کیا جاتا ہے، اور یہی ظلم ہے، جبکہ ظالم کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أَلَا لَعنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ (هود: ١٨)

سب لوگ سن لیں کہ اللہ کی لعنت ہے اِن ظالموں پر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اتقوا الظلم فإن الظلم ظلمات يوم القيامة (المسلم، ح: ٢٥٧٨)

ظلم سے بچو، اِس لیے کہ قیامت کے دن ظلم اندھیروں کی صورت میں ہوگی۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شہید کو قرض کے علاوہ سب چیزیں معاف کی جائے گی(المسلم، ح: ١٨٨٦)

ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

لا يدخل الجنة جسد غذى بحرام (الترغيب والترهيب، ح: ٢٦٨٠)

وہ جسم جنت میں نہیں جائے گا، جس کی پرورش حرام سے ہوئی ہوں۔

اِن تمام نصوص سے یہ بات ثابت ہوگئی، کہ دوسرے کا مال کھانا حرام اور ظلم ہے، اور اللہ تعالی قیامت کے دن اس کا حساب کتاب کرے گا، اور اِس کی وجہ سے آدمی جنت سے محروم ہوگا۔

اسلامی معیشت پر مالِ حرام کے اثرات

حرام مال کے برے اثرات سے اسلامی معیشت اور اس کی ترقی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے، اور حرام مال کی وجہ سے وہ ہر وقت روبزوال رہتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جب کوئی قوم زکوۃ نہیں دیتی، تو اللہ تعالی ان پر قحط مسلط کرتا ہے(الترغيب والترهيب، ح: ١١١٠)

جب کوئی اپنے مال سے زکوۃ نہیں نکالتا، تو اس کا مال ہلاک ہوجاتا ہے، اور ان پر قحط مسلط ہوتی ہے، تو جب کسی کا مال خالص حرام کا ہو تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ حرام مال کی وجہ سے مسلمانوں کی مالی اور اقتصادی ترقی خطرے میں پڑ جاتی ہے، اِس لیے کہ اسلامی معیشت کا دارومدار خالص حلال مال پر ہے، اللہ تعالی ظلماً حرام مال کمانے والے کو تھوڑی مہلت دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے، کہ میں نے اقتصادی ترقی کی، لیکن جب وہ اپنے مال پر اترانے لگتا ہے، تو اللہ تعالی اس کو اچانک پکڑ لیتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحنَا عَلَيهِم أَبوَابَ كُلِّ شَيءٍ حَتَّى إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذنَاهُم بَغتَةً فَإِذَا هُم مُبلِسُونَ (الانعام: ٤٤)

پھر انہیں جو نصیحت کی گئی تھی، جب وہ اسے بھلا بیٹھے تو ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جو نعمتیں انہیں دی گئی تھیں، جب وہ ان پر اترانے لگے، تو ہم نے اچانک ان کو آ پکڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل مایوس ہو کر رہ گئے۔

اِس پورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے، کہ مسلمان کو اپنی کمائی میں حلال اور حرام کی تمیز کا انتہائی خیال رکھنا چاہیے، اِس لیے کہ اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا دارومدار حلال مال پر ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو رزق حلال سے مالا مال فرمائے اور رزق حرام سے بچائے رکھے آمین۔

مولانا محمد کامران ہوتی
دارالعلوم رحمانیہ مردان

مستشرق تھامس کارلائل کی خدمات: تعارفی جائزہ

تمہید

صلیبی اپنے حملوں میں جب شکست خوردہ ہوگئے، تو انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو فکری محاذ پر آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو فکری اور ثقافتی لحاظ سے مفلوج کرنے کے لیے مسلمانوں کے دین کو پڑھنا شروع کر دیا، اور یہی سے تحریک استشراق شروع ہوگئی، انھوں نے نصوص میں تحریف کی، اور کبھی انہی نصوص سے اپنے خواہشات کے مطابق مطلب نکالنے شروع کر دیے، مسلمانوں کے مصادر اصلیہ کو تختۂ مشق بنایا، چنانچہ تاریخ اور حدیث سے متعلق مسئلہ کو ادبی کتب سے اور فقہ سے متعلق مسئلہ کو تاریخ کی کتابوں سے، جبکہ تفسیر سے متعلق مسئلہ کو لغت کی کتابوں سے نقل کرنے لگے، لہٰذا دمیریؒ کے نقل کردہ حدیث کو صحیح اور امام مالکؒ کے نقل کردہ حدیث کو موضوع قرار دینے لگے، اسی تناظر میں انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق تمام علوم کو پڑھنا شروع کر دیا، حکومتوں کی طرف سے حوصلہ افزائی، مصادر کی وافر مقدار اور مکمل فراغت نے انہیں اس قابل بنادیا کہ وہ اپنے بحوث کو علمی رنگ دے سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی ثقافت میں رنگے ہوئے مسلمانوں کے لیے ان کی کتب اور بحوث مرجع کی حیثیت اختیار کرنے لگے، حقیقت یہ ہے، کہ اگر مسلمان انہیں توجہ نہ دیتے تو یہ اپنے مقصد میں اس قدر کامیاب نہ ہوتے، چنانچہ احمد امین مصری کی کتاب فجر الاسلام میں مسلمانوں میں سے منہج استشراق کے تلامذہ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے(۱)

مستشرقین کا امت مسلمہ پر اثرات

مستشرقین کا امت اسلامیہ کی حیات میں بہت بڑا کردار ہے، جس کے ایجابی اور سلبی دونوں قسم کے نتائج ہیں، لہٰذا ان اسباب اور اہداف کو جاننا، جسکی وجہ وہ اس تحریک کی طرف مائل ہوگئے، ازحد ضروری ہے اور اسی وجہ سے مستشرقین کے اُن حالات اور کوششوں کو جاننا، جن کی وجہ سے انھوں نے اس تحریک کو بام عروج تک پہنچایا، بھی ناگزیر ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''تھامس کارلائل'' ہے، یہ مضمون ان کی حالات زندگی اور تحقیقی خدمات پر مشتمل ہے۔

زیرنظر مضمون ایک مقدمہ اور دو بحثوں پر مشتمل ہے،مقدمہ میں استشراق کی تعریف،مستشرقین کی اقسام،استشراق کے مقاصداور مستشرقین کے اثر رسوخ کے مقامات کا تذکرہ ہے، بحث اول میں موصوف کی حالات زندگی اور خدمات کا تذکرہ،جبکہ بحث ثانی میں موصوف کی کتاب Heroes and Hero worship(البطولة و عبادة الابطال)(۲)پر مختصر تبصرہ ہے۔

مقدمہ:استشراق (Orientalism)اور مستشرق (Orientalist) دونوں اصطلاحیں لفظی لحاظ سے بہت پرانی نہیں ہیں،انگریزی زبان وادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارویں صدی کے آواخر میں شروع ہوئی،تحریک استشراق صدیوں مصروف عمل رہی،لیکن اس کا کوئی باضابطہ نام نہ تھا،اربری(۳) کا کہنا ہے کہ مستشرق کا لفظ پہلی بار۱۶۳۰ء میں مشرقی یونانی کلیسا کے ایک پادری کے لیے استعمال ہوا،انگلستان میں ۱۷۷۹ء کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی اس نے رواج پایا،سب سے پہلے ۱۸۳۸ء میں فرانس سے شائع ہونے والی لغت میں استشراق کی اصطلاح درج کی گئی(۴)

استشراق کی لغوی تعریف

ش،ر،ق کا مادہ روشنی اور کھولنے پر دلالت کرتا ہے،(۵)طلوع آفتاب کو شروق الشمس کہا جاتا ہے(۶) اسی طرح ذوالحجہ کے دنوں کو ایام التشریق کہا جاتا ہے کیونکہ قربانی کے جانور سورج نکلنے کے بعد ذبح کیے جاتے ہیں(۷) طلوع آفتاب کی جگہ کو مشرق اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے(۸)

استشراق کی اصطلاحی تعریف

غیر مشرقی لوگوں کا لسانیاتِ مشرق،تہذیب،فلسفے،ادب اور مذہبی علوم میں مہارت کے لیے جدوجہد کا نام استشراق ہے(۹)ایک تعریف یہ بھی ہے کہ مغربی اہل کتاب اور مسیحی،مغرب کی اسلامِ مشرق پر نسلی اور ثقافتی برتری کے زعم کی بنیاد پر مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم کرنے کے لیےاور مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں گمراہی اور شک میں مبتلا کرنے اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی غرض سے،مسلمانوں کے عقیدہ،شریعت،ثقافت،تاریخ، نظام اور وسائل وامکانات کا جو مطالعہ غیر جانبدارانہ تحقیق کے دعوے کے ساتھ کرتے ہیں،اسے استشراق کہا جاتا ہے(۱۰)اس تعریف میں بظاہر یہ خامی نظر آتی ہے کہ اس میں سارا زور مستشرقین کو اسلام و مسلمانوں پر کام کرنے والوں کو کہا گیا ہے جو کہ ٹھیک نہیں، کیونکہ ہر وہ غیر مشرقی شخص جو مشرقی علوم،ادیان اور تہذیبوں پر کام کرتا ہے وہ بھی معروف

معنوں میں مستشرق ہے، مستشرقین کی اصطلاح میں لفظ مشرق کا جغرافیائی مفہوم مراد نہیں، بلکہ ان کے ہاں اس اصطلاحِ استشراق و مستشرق میں زمین کے وہ خطے ہیں، جن پر اسلام کو فروغ حاصل ہوا، گویا لفظِ مشرق سے مراد اسلامی مما لک ہیں، اور دنیائے اسلام کو وہ مشرق کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مشرق کے اس مفہوم کے تحت مستشرقین کی عملی جدوجہد جن خفیہ مقاصد کی غمازی کرتی ہے اور جن کا اظہار کبھی کبھی بعض مستشرقین کی طرف سے ہوتا رہتا ہے، ان کو اور مستشرقین کے بے شمار علمی کارناموں اور ان کے مختلف طبقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، مستشرقین کی یوں تعریف کی جاسکتی ہے: اہل مغرب بالعموم اور یہود و نصاری بالخصوص، جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیبوں، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور تہذیب مسلط کرسکیں اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے ان کے وسائل کا استحصال کرسکیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ منسلک ہیں، وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔

مستشرقین کی اقسام

مستشرقین کا رویہ ہر زمانے میں یکساں نہیں رہا، اس لیے ان کے ہاں علم، تجربہ، انداز استدلال، مذہبی حیثیت اور وابستگی و انسلاک کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں، اور اسی لحاظ سے ان کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مستشرقین نے کئی مفید کام بھی کیے ہیں، جس پر ان کی تعریف کی جانے چاہیے۔

دوسری طرف مستشرقین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بنی نوع انسان کے لیے فکری بے اعتدالی، نظریاتی بے راہ روی اور تہذیبوں کی تباہی کا باعث بنے ہیں یہ لوگ قابل مذمت ہیں، مستشرقین کے کام کی نوعیت و حیثیت جاننے کے لیے ان کو کئی اقسام اور طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

معتدل مزاج مستشرقین

یہ مستشرقین کا وہ گروہ ہے، جو مسلمان نہ تھے اس لیے ان کا آبائی ادیان کے زیر اثر ہونا فطری بات تھی، اس لیے ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی، کہ وہ اسلام کو بالکل اسی نظر سے دیکھیں جس سے مسلمان دیکھتے ہیں، اس طبقے کی تحریروں میں بے شمار غلطیاں تو ہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ اسلام، محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور اسلامی تعلیمات کو زبردست خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں، ان میں چند مستشرقین یہ ہیں: کاسن دی پرسیول، رچرڈ سائمن، گاڈ فرے ہگنز، یوہان جے ریسکے، مائیکل ایچ ہارٹ، نیان، ول ڈیورنٹ، کانسٹنٹ اور تھامس کارلائل۔

متعصب مستشرقین

اس طبقے میں ان مستشرقین کو رکھا جاتا ہے جن کا مقصد بے لاگ اور غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کے لبادے میں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنا ہیں، اس طبقے میں مزید تقسیم کی جاسکتی ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں تبدیلی آتی رہی ہے، ان میں چند مشہور افراد یہ ہیں، کیمون، جیبن برڈ، ہمفرس پرائی ڈیکس، سر ولیم میور، جارج سیلاور، گولڈزیہر۔

پیشہ ور مستشرقین

وہ مستشرقین جن کو جامعات، تحقیقی اداروں، مجلّات، اخبارات، ٹیلی ویژن وغیرہ میں ''اس کام'' کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے، ان کا کام اکثر سیاسی و مذہبی تعصب پر مبنی ہوتا ہے، اس کی مثال برطانوی ہند میں انگریز عہدہ داروں کا کام ہے اسی طرح اکیسویں صدی میں اسلامی فوبیا پیدا کرنے میں بھی ایسے لوگ شامل ہیں۔

مستشرقین کے اہداف ومقاصد

مستشرقین کے مختلف مقاصد تھے، مثلاً:

دینی اہداف و مقاصد :تحریک استشراق اسلام کے راستے میں بند باندھنے کی کوششوں کا ہی حصہ ہے، استشراق کے پروان چڑھنے میں درپردہ دینی مقصد ہی کارفرما تھے، استشراق کے اس طویل سفر میں مندرجہ ذیل اموراس کے ساتھ تھے:

☆ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے صحیح ہونے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، نیز یہ باور کرانا کہ احادیث نبویہ کو مسلمانوں نے قرون ثلاثہ میں ایجاد کیا ہے۔

☆ قرآن کریم کے صحیح ہونے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، نیز قرآن کریم میں طعن وتشنیع کرنا۔

☆ اسلامی فقہ کی وقعت کو کم کرنا اور اسے رومن فقہ باور کرانا۔

☆ عربی زبان کو ختم کرنا، نیز یہ باور کرانا کہ عربی زبان زمانے کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتی ہے۔

☆ اسلام کی اصل یہودیت اور نصرانیت کو قرار دینا۔

☆ تبلیغ کرنا اور مسلمانوں کو عیسائی بنانا۔

☆ اپنے افکار ونظریات کی تقویت کے لیے موضوع احادیث کا سہارا لینا۔

☆ اسلام کی حقانیت اور اس کے ساتھ اہل اسلام کی جذباتی لگاؤ کو کم کرنے کے لئے مناسب دلائل تلاش کرنا۔

☆ اقوام عالم میں اسلامی پھیلاؤ کو روکا جائے۔

☆ مشنری سرگرمیوں کو منظم اور مربوط کیا جائے۔

تحقیقی اور علمی اہداف و مقاصد: مستشرقین کے تمام علمی اور تحقیقی کاموں کے پیچھے علم کی خدمت کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا، بلکہ علم کی خدمت کی آڑ میں اسلام سے مقابلہ کیا جاتا ہے، لیکن یہ اصول تمام مستشرقین پر لاگو نہیں ہوتے، ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے، کہ انہوں نے صرف علم کے حصول اور علم کی خدمت کے جذبے سے اپنی زندگیاں تحقیق کے خارزار وادی میں گزار دیں، اسلامی موضوعات پر ان کے علم سے ایسی باتیں نکلی ہیں جن میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق منصفانہ رویہ اختیار کیا گیا، گو ان کی تحریروں میں بہت سی غلط باتیں بھی ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک آدمی مسلمان نہ ہو اور اس کے پیش نظر کتابوں کا وہ ذخیرہ ہو، جو اسلام کے متعلق زہریلے پروپیگنڈے سے پُر ہو، تو اس آدمی سے اس قسم کی غلطیوں کا صادر ہونا عجیب نہیں۔

مالی اور اقتصادی اہداف و مقاصد: علمی اور دینی مقاصد کے ساتھ ساتھ تجارتی اور مالی مقاصد بھی مستشرقین کے پیش نظر تھے، جن کی وجہ سے وہ مشرقی زبانوں اور مشرق کے دیگر حالات کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوئے، اہل مغرب خصوصاً اٹلی کے لوگوں کے مشرقی ممالک کے ساتھ قدیم تجارتی تعلقات تھے، اہل مشرق کے ساتھ اپنے تجارتی معاملات کو اچھے طریقے سے طے کرنے کے لئے انہوں نے عربی زبان کی تعلیم کو ضروری سمجھا، ان کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۲۶۵ء میں تیونس اور اٹلی کے شہر بیرا کے تاجروں کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا، اسے عربی زبان میں لکھا گیا۔

سیاسی اہداف و مقاصد: مستشرقین کا ایک ہدف یہ بھی تھا، کہ مسلمانوں میں بھائی بندی کی فضاء کو ختم کر کے ان میں تفرقہ ڈال کر ان پر غلبہ حاصل کیا جائے، اور ہمیشہ سے استعماری قوتیں اپنے وظیفہ خوروں کو نوآبادیاتی ممالک میں ان کی زبان، آداب اور ادیان کی تحقیق پر مامور کرتے تھے کہ یہ معلوم کرسکیں کہ ان ممالک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں کس طرح حکومت کی جاسکتی ہے، چنانچہ ''لورانس بروان'' نے اپنے استشراقی جذبات کا اظہار اس طرح کیا ''حقیقی خطرہ اسلامی نظام، اس کے پھیلنے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت اور اس کی قوت حیات میں ہے، مغربی استعمار کے راستے میں یہی واحد دیوار ہے'' (۱۱)

پھیلاؤ اور اثر ورسوخ کے مقامات

☆ مغرب ہی وہ مناسب خطہ ہے جس پر مستشرقین سرگرم رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین زیادہ تر جرمنی، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور ہنگری کے باشندے ہیں، بعض مستشرقین اٹلی اور اسپین میں بھی نمودار ہوئے۔

☆ حقیقت یہ ہے کہ استشراق کا سورج امریکہ میں زیادہ چمکا، چنانچہ امریکہ میں استشراق کے بہت سے مراکز ہیں۔

☆ مغربی حکومتوں، کمپنیوں، کمیٹیوں، اداروں اور کلیساؤں نے استشراقی تحریک کی امداد و تائید کرنے اور یونیورسٹیوں میں انہیں کھلا چھوڑنے میں بالکل بخل سے کام نہیں لیا، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔

☆ دراصل استشراقی تحریک، استعمار و نصرانیت کی خدمت کے لیے مسخر تھی اور آخر میں یہودیت اور صیہونیت کی بھی خادم بن گئی، ان تمام قوتوں کا ہدف مشرقِ اسلامی کو کمزور کر کے براہ راست یا بالواسطہ اس پر تسلط جمانا ہے۔

بحث اول: مشہور معتدل مزاج مستشرق ''تھامس کارلائل'' اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے، آپ بیک وقت مصنف، مضمون نگار، مؤرخ، ریاضی دان، طنز نگار، اور استاذ تھے، ۴ دسمبر ۱۷۷۵ء کو پیدا ہونے والے یہ مشہور فلسفی مستشرق اپنے وقت کے سب سے زیادہ اہم سماجی مفسرین میں سے تھے۔

تھامس کارلائل اپنی زندگی کی ابتداء میں پادری اور راہب بننا چاہتے تھے، بعد میں اس خیال کو اگرچہ ترک کر دیا، لیکن پھر بھی اس نے ساری عمر ایک مذہبی واعظ کی طرح گزاری، ایک صاحب طرز واعظ ہونے کے ناطے اس کا نظریہ تھا، کہ کام ہمیشہ انسان کو پہنچنے والی مصیبتوں اور بیماریوں کا علاج ہے، اس کا یہ بھی نظریہ تھا، کہ تاریخ عالم دنیا کے بڑے لوگوں کی سیرت ہی کا نام ہے۔

تھامس کے والد غریب تھے، لیکن باپ کی غربت تھامس کے علم حاصل کرنے میں رُکاوٹ نہیں بنی، قابلیت ابتداء سے عیاں تھی، چنانچہ جب پندرہ سال کے ہو گئے، تو یونیورسٹی آف ایڈنبرا میں داخلہ لے لیا، وہاں گریجویٹ کرنے کے بعد ریاضیات کے استاذ مقرر ہو گئے، ۱۸۱۹ء میں کارلائل دوبارہ جامعہ ایڈنبر میں قانون پڑھنے کے لئے آ گئے، قانون پڑھنے کے بعد کارلائل کو ادبی ذوق لگ گیا، لہٰذا اپنی ادبی زندگی شروع کرنے کے لئے جرمن سوچ کا مطالعہ کرنے لگے، اپنے ادبی شوق کو مزید تقویت دینے کے لئے ۱۸۲۳ء میں ''لندن میگزین'' میں جرمن شاعر ''chelor'' کے بارے میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، مزید ترقی کیلئے اگلے سال Nelson، montesguie اور Montaigne کی سوانح عمری لکھنے لگا، ۱۸۲۶ء میں '' جین ویلچ '' سے شادی کرنے کے بعد چھ سال تک کارلائل نے اخلاقی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور ''resatus'' نامی کتاب میں اپنے خیالات پیش کیے، اس کتاب میں کارلائل کے خیالات ایسے تدریجی انداز میں مذکور ہیں، کہ گویا یہ اس کی سوانح عمری ہے۔

۱۸۳۴ء میں کارلائل نے چیلسی کے پڑوس میں رہنے کا ارادہ کیا، تو اپنی بیوی کیساتھ وہاں رہنے کے لئے منتقل ہوگئے، اور یوں کارلائل لندن کے اس محلے میں رہنے لگے، جہاں فنکار رہتے تھے، موصوف نے اپنی ''۸۶'' سالہ لمبی عمر کے بقیہ ایام وہاں گزارے (۱۲) کارلائل صاحب طرز مصنف بھی تھے، انقلاب فرانس کی تاریخ پر کتاب لکھی، جسکا عربی ترجمہ تاریخ الثورۃ الفرنسیۃ ہے، ۱۸۳۷ء میں جب یہ کتاب منظر عام پر آگئی، تو اس نے کارلائل کو تاریخ میں روشن ستارہ بنا دیا، اس کتاب سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۱ء تک مختلف لیکچرز دیئے، ان تمام محاضرات کو الادب الالمانی کا نام دیا گیا۔

ان محاضرات میں سے اہم کو کارلائل نے On Heroes And Hero Worship And The Heroic In History نامی کتاب میں جمع کیے ہے، جسکا عربی ترجمہ البطولۃ و عبارۃ الابطال کے نام سے منظر عام پر آگیا، اس کتاب نے کارلائل کو معتدل اور منصف مزاج مستشرقین کے صف میں کھڑا کر دیا، اس کتاب میں کیا ہے اس پر آئندہ سطور میں تبصرہ ہوگا۔

۱۸۴۳ء میں سیاسی مشکلات اور موضوعات پر بحث کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی، جو الماضی والحاضر کے نام سے عربی میں موجود ہے، اس کتاب میں کارلائل نے عوامی حقوق اور انہیں حاصل کرنے کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور ساتھ ساتھ کارلائل نے ایک مضبوط اور عقل مند حکمران طبقے کی ضرورت پر زور دیا، اسی سال یونیورسٹی آف ایڈنبرا کے سر کے لقب سے نوازے گئے، اس وسیع کامیابی اور شہرت کے بعد کارلائل ۱۸۶۶ء میں آرام کی غرض سے گوشہ نشین ہوگئے، تب اس کی عمر ۷۰ سال تھی، اور بیوی بھی وفات پاگئی تھی۔

مختلف میدانوں میں قلمی گھوڑے دوڑانے کے بعد ۱۸۷۴ء میں ملکہ وکٹوریہ کارلائل کو "lord" کا لقب دینے لگی، تو کارلائل نے بڑی شائستگی سے اس اعزاز کو قبول کرنے سے معذرت کر لی، اور ملکہ کے وزیر اعظم پر یہ بات واضح کر دی کہ یہ لقب میری صلاحیت میں اضافہ نہیں کر سکتی، مزید وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے ''کہ بڑے القاب اچھی نہیں لگتی''، اور ویسے بھی ۸۰ سال عمر کے بعد نا قابل اعتبار چیزوں کی مجھے ضرورت نہیں، کوئی نہیں جانتا، کہ کارلائل نے جب روسی وزیر اعظم سے ''آرڈر آف میرٹ'' کا لقب لیا، تو ملکہ کے لقب کو کیوں ٹھکرایا (۱۳،۱۴)

بحث ثانی: اس زمانے میں جب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، تو کارلائل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہ حقیقت بیان کی جس کے صرف سننے کا بھی مستشرقین میں تاب نہیں تھی۔

تھامس کارلائل نے اپنی کتاب "Heroes and hero worship" میں ان شخصیات پر تبصرہ کیا

ہے، جنہوں نے زندگی کے کسی شعبے میں متاثر کن کردار ادا کیا ہو، جس شخص نے جس میدان میں کمال کا مظاہرہ کیا ہو، کارلائل نے اس شخص کو اس میدان کا ''ہیرو'' قرار دیا ہے، چنانچہ کارلائل نے نبوت کے میدان کا مرد کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا، اور عنوان یوں رکھا "Hero as a Prophet" اور اس کتاب کے عربی ترجمہ میں مذکورہ عنوان یوں ہے البطل نبیا محمد ﷺ اس کتاب میں کارلائل نے ہر میدان میں دو یا زیادہ شخصوں کو ہیرو قرار دیا ہے، لیکن دو میدان ایسے ہیں، جہاں کارلائل کو ایک ایک شخص کے علاوہ کوئی قابل ذکر شخصیت نہ مل سکی، چنانچہ عربی مترجم نے دین اور الہٰ کے میدان میں عنوان یوں لگایا ہے البطل الهاً اسطوریاً اور نبوت کے میدان میں اس کا عنوان یوں ہے البطل نبیا محمد ﷺ۔

لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسطوری ایک افسانوی اور خیالی شخصیت تھے، لہٰذا ایک میدان میں بطول کا سہرا جس ایک شخصیت کے سر کارلائل نے باندھا ہے، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بطل الابطال ہو گئے، اس کتاب کے مضامین میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھے گئے مضمون کو الگ کتاب میں چھاپا گیا ہے، اور اس کا نام ہے محمد المثل الاعلی اس کتاب میں کارلائل نے سیرت کے بارے میں وہ حقائق بیان کیے ہے، کہ مغرب آج تک اس سے بے خبر ہے۔

ایک جگہ حقیقت بیان کرتے ہوئے کارلائل یوں رقم طراز ہے: سب سے بڑی شرم کی بات یہ ہے، کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی اس بات کی طرف دھیان دے دیں، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (العیاذ باللہ) دھوکہ باز اور جھوٹے تھے، اور اب ہمیں چاہیے کہ اس قسم کے اقوال کو رد کر دیں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین بارہ صدیوں سے دوارب انسانوں کیلئے چمکتے سورج کی مانند ہے، وہ بھی ہماری طرح انسان ہے، تو پھر کیا کوئی یہ گمان کر سکتا ہے، کہ ایک جھوٹے اور دھوکہ باز دین پر اتنے لوگ اتنے عرصے کے لئے قائم رہ سکتے ہیں، کہ ان کا جینا مرنا اس دین کے ساتھ ہوں، میں (کارلائل) تو کبھی بھی اس گمان اور سوچ کا قائل نہیں ہونگا، اگر چہ یہ سوچ جتنا بھی عام ہو جائے۔

کچھ آگے رقم طراز ہے: یہ کیسے ممکن ہے، کہ ایک جھوٹا دین بارہ صدیوں تک قائم ہو، اور اسکے ماننے والے اور عمل کرنے والے دوارب انسان ہوں، اس دین کو ختم ہونا چاہئے تھا، اور اس عمارت کو تو منہدم ہونا چاہئے تھا۔

مزید لکھتے ہیں: ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی جھوٹا اور متصنع آدمی قرار نہیں دے سکتے، وہ ایسا آدمی نہیں تھا کہ بادشاہت اور سلطنت جیسی چھوٹی موٹی چیزوں کا متمنی ہوں۔

اور ایک جگہ تو حد کر دیا ہے، لکھتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شہاب ثاقب تھے، جس نے پوری دنیا کو منور کر دیا، ذلك امر الله، وذلك فضل الله يؤتيه من يشا والله ذوالفضل العظيم۔

ذرا آگے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق اور امانت والے وصف کی یوں تشریح کرتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک فکر مند نوجوان تھے اسکے ساتھی ایسے امین کے لقب سے پکارتے تھے، ایسا آدمی جو اپنے اقوال اور افعال دونوں میں صادق ہوں، اسکے ساتھی جانتے تھے، کہ اسکے منہ سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ حکمت اور بلاغت سے مزین ہوتا ہے۔

دنیاوی طمع اور لالچ سے مبرا ہونے کے بارے میں کارلائل کا بیان یوں ہے: متعصب نصاری اور ملحدین کا خیال ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ذاتی شہرت اور جاہ وجلال تھا، اللہ تعالی کی قسم اس عظیم آدمی کے دل میں کوئی دنیاوی لالچ اور طمع نہیں تھا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شہوات سے بری ہونے کے بارے میں کارلائل کا تجزیہ یہ ہے کہ " ہم کس قدر غلطی پر ہونگے، اگر ہم اس بات کے قائل ہو جائے، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہوت پرست تھے، حالانکہ وہ اپنے کھانے، پینے، لباس اور تمام امور میں ایک متواضع شخصیت تھے، صرف روٹی اور پانی پر گزارہ کرنے والے اس فاقہ مست پیغمبر کے گھر میں دو دو ماہ تک چولھا نہیں جلتا تھا، اپنے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو سینے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں فخر اور تکبر کہاں سے آسکتی ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھوڑی سی بھی تکبر ہوتی تو سخت مزاج عرب ۲۳ سال تک آپ کے تابع ہرگز نہیں ہوتے، میرا تو اپنا یہ خیال ہے، کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ قیصر اپنے جاہ وجلال کے ساتھ انکے سامنے ہوتا، تو وہ ہرگز قیصر کے اس قدر تابع نہ ہوتے، جس قدر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع وفرمانبردار تھے، اسی کو عظمت کہتے تھے، اور ابطال (heroes) اس طرح ہوتے ہیں۔

یہودی ہونے کے باوجود اپنے پیشواؤں کو چھوڑ کر کارل لائل نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موضوع میں بطور ہیرو منتخب کر کے اس مغرب زدہ لوگوں حیران کر دیا جو ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ناگفتہ بہ وصف سے متصف کرنے کے عادی تھے، اس سے جہاں یہ بات سامنے آئی کہ ہر معاشرے میں چند افراد معتدل ذہنیت کے ہوتے ہیں وہی اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالی اس دین کی تائید ایک غیر دین سے بھی کرتے ہیں۔

مصادر ومراجع

(۱) مصطفی السباعی، الاستشراق والمستشرقون، ص ۲۲، دار الوراق، بیروت۔

(۲) تعریب، مصطفیٰ بن حسنی السباعی۔

(۳) آربری، ا، ج (Arthur John Arberry) برطانیہ میں ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے، کیمرج یونیورسٹی میں لسانیات مشرق سیکھی اور بعد میں اسی یونیورسٹی میں فارسیات اور افریقی زبانوں کی تدریس سونپی گئی، آپ ادب عربی کے بھی ماہر شمار ہوتے ہیں، مختلف فنون میں قابل قدر تصنیفات چھوڑی جس میں چند یہ ہیں: The Koran Interpreted، The Holy Koran ۱۹۶۹ء کو دار فانی سے

رحلت کرگئے، دیکھئے:یحی مراد، معجم اسماء المستشرقین، حرف الالف، ص٨٤، دارالکتب العلمیة بیروت،

(۴) عمر بن ابراهیم رضوان، آرء ا المستشرقین حول القرآن الکریم وتفسیره، دارطیبه الریاض، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(۵) احمد بن فارس الرازی، معجم مقاییسس اللغة،ماده: شرق، ج۳ص۲۶۴،دارالفکر بیروت،۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹م۔

(٦) اسماعیل بن حماد الجوهری، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربیة، ماده: شرق، ج٤ص١٥٠١، دارالعلم للملایین بیروت، الطبعة الرابعة: ١٤٠٧ھ/١٩٨٧م۔

(۷) خلیل بن احمد الفراهیدی، کتاب العین، الشین والراء، ج٥ص٣٩، دارالهلال بیروت، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(٨) محمد بن محمد مرتضی الزبیدی، تاج العروس من جواهر القاموس، ماده: شرق، ج٢٥ص٤٩٣، دارالکتب العلمیة بیروت، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(۹) محمود حمدی زقروق، الاستشراق والخلفیة الفکریة للصراع الحضاری، ص١٩، دارالمعارف کورنیش قاهره،مصر، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(۱۰) علی بن ابراهیم النملة، مصادر المعلومات عن الاستشراق والمستشرقین، ص١٥، مکتبة الملك فهد الوطنیة١٤١٤ھ/١٩٩٤م۔

(۱۱) عبدالقهار العانی،الاستشراق والدراسات الاسلامیه، ص٢٩، دارالفرقان، عمان۔

(۱۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: "Thomas Carlyle" (bio), Dumfries-and-Galloway, 2008, webpage: dumfries-and-galloway.co.uk-carlyle

(۱۳) معجم اسماء المستشرقین، حرف الکاف، ص٥٤٨۔

(۱۴) دیکھئے: "Carlyle, Thomas (1849). "Occasional Discourse on the Negro Question", Fraser's Magazine for Town and Country, Vol. XL., p. 672.

مفتی فضل غنی صاحب

مدرس معہد ھذا

مقدار صاع اور مد
اقوال فقہاء کی روشنی میں

فقہاء میں ایک مسئلہ یہ زیر بحث رہا ہے کہ جن شرعی احکام کا تعلق مخصوص پیمانوں (صاع، مد، رطل وغیرہ) کے ساتھ ہے، ان پیمانوں کی درست پیمائش کیا ہے؟ دور اول کے فقہاء میں اس حوالے سے حجازی یا عراقی پیمانوں میں فرق کی بحث مشہور ہے، صحابہ اور تابعین میں سے ایک گروہ نے اس ضمن میں یہ موقف اختیار کیا کہ ان امور کا تعلق عرف سے ہے، چنانچہ جس علاقے میں جو بھی پیمانہ رائج ہو اور اس کی جو بھی مقدار ہو، لوگ اسی کے مطابق واجبات کی ادائیگی کریں اب جہاں صاع اور مد کے پیمانے رائج نہ ہو تو لوگ کس مقدار کے مطابق ادائیگی کریں؟ اسی مسئلہ کے پیش نظر ذیل میں فقہاء امت کے اقوال کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت اور مقدار صاع اور مد پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

چونکہ ناپ وتول کے متعلق شریعت مطہرہ نے بہت سے احکام اور مسائل کی وضاحت بڑے شاندار انداز سے کی ہے جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اوزان اور پیمانوں کے مطابق بیان فرمایا ہے مثلاً صاع، مد، اوقیہ، درہم، دینار، مثقال وغیرہ، اب اکثر ممالک بشمول پاکستان میں اپنے اپنے اوزان اور پیمانے رائج ہیں اس لیے ان احکام کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ ان اوزان اور پیمانوں کو مروجہ اوزان کے مطابق بیان کیا جائے، کیونکہ صدقہ فطر و کفارات کی معرفت موقوف ہے مقدار مد وصاع کی معرفت پر، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مسائل شرعیہ میں مد اور صاع کثیر الذکر ہے، لہٰذا فقہاء کرام کے اقوال کی روشنی میں اس کی تشریح کی جاتی ہے۔

باتفاق ائمہ مجتہدین صاع میں چار مد ہوتے ہیں لیکن مد کا وزن کیا ہے؟ اس میں ائمہ کرام کا باہمی اختلاف ہے۔

قول اول: امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مد دو رطل کا ہوتا ہے اور ایک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے یہی مذہب فقہاء عراق کا بھی ہیں۔

علامہ کوثریؒ اپنی کتاب احقاق الحق میں لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں بہت سے ائمہ مثلاً ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ،

ابن ابی لیلیؒ ،شریکؒ اورموسیٰ ابن ابی طلحہ وغیرہم امام صاحب کے موافق ہیں لہٰذا یہ اعتراض صحیح نہیں کہ امام صاحب اس مسئلہ میں متفرد ہیں امام ابو یوسفؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

قول ثانی: امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ایک صاع ایک صاع پانچ رطل اور ایک ثلث یعنی ۵۱/۳ رطل کا ہوتا ہے بعض علماء لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ نے امام مالکؒ کے ساتھ مناظرہ کے بعد اس کے قول کی طرف رجوع کیا اس مناظرے کا ذکر متعدد کتابوں میں موجود ہے۔

مناظرے کا بیان

امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ کے مابین اس مناظرے کا ذکر السنن الکبریٰ للبیہقی میں موجود ہیں عـــــــن

الحسين بن الوليد القرشي قال قدم علينا ابويوسف (اى فى المدينة) من الحج فقال انى اريدان افتح عليكم باباً من العلم اهمنى ففحصت عنه فقدمت المدينة فسألت عن الصاع فقالوا صاعناهذاصاع رسول الله صلى الله عليه وسلم بہرحال دونوں کے مابین مقدار صاع میں بحث ہوئی امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ صاع کی مقدار آٹھ رطل ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ وہ ۵۱/۳ رطل کا ہوتا ہے۔

اہل مدینہ نے کہاصاعناهذا صاع رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت ماحجتكم قالوا ناتيك بالحجة غداً فلمااصبحت اتانى نحو من خمسين شيخاً من ابناء المهاجرين والانصارمع كل رجل منهم صاع تحت ردائه وقالوا سمعناآباء ناواجدادنا ان هذا صاع رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فعيرته فاذا هوخمسة ارطال وثلث بنقص يسيرفتركت قول ابى حنيفةؒ واخذت بقول اهل المدينة انتهى مختصراً(السنن الكبرى للبيهقى : ح ۷۷۲۱) بعض علماء نے جولکھا ہے کہ امام ابو یوسف نے امام مالک کے قول کی طرف رجوع کیا ہے علامہ ابن الہمام نے اس سے انکار کیا ہے وہ لکھتے ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ کے مناظرے کا واقعہ صحیح نہیں ہے نہ درایۃً اور نہ روایۃً، روایۃً اس لئے کہ اس قصہ کے رواۃ اور شیوخ مجاہیل ہیں اور عندالمحدثین مجہول راوی کی روایت معتبر نہیں اور درایۃً بھی صحیح نہیں کیونکہ امام محمدؒ نے اپنی تصنیفات میں امام ابو یوسفؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے مابین جن جن مسائل میں اختلاف ہوا ان کا ذکر کیا ہیں، لیکن آپ نے مسئلہ ہذا میں ان کے درمیان کسی اختلاف کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ اس واقعہ کے ضعف کا قوی دلیل ہے۔(فتح القدیر ج۲،ص۳۰۲) نیز علامہ زاہد کوثری اپنی کتاب احقاق الحق میں لکھتے ہیں واماخبر الحسين بن الوليد فممّايبعد ان يتمسك بمثله ابويوسف للجهل باعيان الرواة ورجال اسانيدهم فى الطبقات كلها على ان هذا الخبر لوصح لماانفرد

به رجل من خارج المذهب انتهى، نیزالشیخ مسعود بن السندھیؒ نے لکھا ہے کہ ولاخلاف بین ابی حنیفة وابی یوسف الافی وزن الرطل لان عند ابی حنیفة الرطل عشرون استاراً وعندابی یوسف ثلاثون استاراً۔

قرون اولیٰ میں صاعِ مستعمل

قرون اولیٰ میں تین صاع مستعمل تھے

☆ صاع عراقی (آٹھ رطل کا) اس کو صاع عمری اور صاع کوفی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے اس کورائج کیا تھا۔

☆ صاع حجازی (۵۱/۳ رطل) یعنی ایک صاع پانچ رطل اور ایک ثلث۔

☆ صاع ہاشمی اس کا مقدار ۳۲ رطل ہے یہ سب سے بڑا ہے اور باتفاق ائمہ یہ صاع متروک اور غیر معتبر ہے کفارات وصدقہ وغیرہ احکام شرعیہ میں اس طرح غسل ووضوء کی احادیث میں مذکور صاع سے مراد صاع ہاشمی مراد نہیں (ریاض السنن ج ۳ ص ۱۳۲، ۱۳۱)

اختلاف بین الفقہاء

اختلاف اس بات میں ہے کہ ان میں صاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونسا تھا؟ احناف کے نزدیک صاع سے مراد صاعِ عراقی ہے اور شوافع کے نزدیک صاع سے مراد صاعِ حجازی ہے۔

دلائل احناف

☆ عن انس کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یتوضأ باناءٍ یسع رطلین ویغتسل بالصاع (ابوداؤد : ح ۹۵) حدیث مذکور سے ثابت ہوا کہ اناء دو رطل کا تھا پس ثابت ہوا کہ مد دو رطل کا ہوتا ہے کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وضو مُد سے کیا کرتے تھے چونکہ مد ربع صاع کا ہوتا ہے لہٰذا واضح ہوا کہ صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔

☆ عن موسی الجھنی قال اتی مجاھد بقدح حزرتہ ثمانیة ارطال فقال حدثتنی عائشة ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یغتسل بمثل ھذا (نسائی، طحاوی) حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا برتن آٹھ رطل کا تھا، پس ثابت ہوا کہ صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاع سے غسل فرمایا کرتے تھے۔

☆ روی ابن ابی شیبة فی مصنفہ والزیلعی فی نصب الرایہ والطحاوی عن الحسن بن صالح قال صاع عمر (عمر بن الخطاب) ثمانیة ارطال۔

☆ عن ابراهيم النخعیؒ قال عير ناصاع عمر فوجدنا حجاجياً والحجاجی عندهم ثمانية ارطال (طحاوی بسند صحيح)

☆ **علامہ کشمیریؒ لکھتے ہیں کہ احوط صدقات وکفارات میں صاع عراقی پر عمل کرنا ہے** للخروج عن العهدة بيقين **حاصل یہ ہے کہ روایات میں تعارض ہے تو ہم** عمل علی وفق الاحتیاط **کرتے ہیں اور احتیاط صاع عراقی کے لیے مرجح ہے کیونکہ صاع عراقی بڑا ہے صاع حجازی سے اور بڑے پر عمل کرنے میں شک باقی نہیں رہتا** کمالا یخفٰی(العرف الشذی ج۱، ص ۱۰۹)

ائمہ ثلاثہ کے دلائل

☆ **ائمہ ثلاثہ استدلال کرتے ہیں** قصة ابويوسف مع اهل المدينة **سے، جس میں مناظرہ کا تذکرہ ہے** وقد تقدم بيان ذلك **اس قصہ میں مذکور ہے کہ پچاس شیوخ مدینہ نے گواہی دی کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاع ہے اور یہ ۵۱/۳ رطل کا تھا، اس قصہ سے استدلال درست نہیں** کماتقدم ذکرہ۔

☆ فدیہ کے بارے میں شیخین کی **مرفوع حدیث** ہے حاصله انه اطعم ستة مساكين لكل مسكين نصف صاع وفی رواية فرقا بين ستة **فرق سولہ رطل کا ہوتا ہے پس ظاہر ہوا کہ ہر مسکین کے لیے نصف صاع ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ فرق تین صاع ہے اور ایک فرق سولہ رطل کا ہوتا ہے اس سے نتیجہ ظاہر ہوا کہ ایک صاع ۵۱/۳ رطل کا ہوتا ہے کیونکہ اگر صاع آٹھ رطل کا ہو تو ایک فرق دو صاع بنتا ہے اور دو صاع چھ مساکین کے لیے کافی نہیں ہو سکتے، دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ذکرِ فرق مدرج من الراوی ہو یعنی راوی نے از خود درج کیا ہو**(رياض السنن للروحانی البازیؒ ج۲ ص ۱۳۳)

زمانہ حال کے رائج اوزان کے مطابق مقدار صاع

صاع حنفی (عراقی ، عمری، کوفی ، حجاجی) کے بارے میں بیان سابق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آٹھ رطل کی ہے رائج الوقت اوزان کے مطابق یہ صاع دوسوستر تولے کا ہوتا ہے تو ایک صاع تین سیر چھ چھٹانک کا ہوا کیونکہ ایک سیر اسی تولے کا ہوتا ہے اور ایک چھٹانک پانچ تولے کا ہوتا ہے، شیخ محمد ہاشم سندھیؒ نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ نے مقدار صاع شرعی معلوم کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے صاع طلب کیا پھر اس کی مقدار کی تحقیق کی گئی اور معلوم ہوا کہ وہ صاع دوسوستر تولے کے برابر ہے(العرف الشذی ص۱۰۹)

رطل، مثقال، درہم اور دینار کی مقدار

☆ رطل صاع کوفی کا ثمن ہے صاع کوفی ۲۷۰ تولہ ہے لہذا رطل ۳۴ تولہ سے کچھ کم ہوگا بعض

حضرات نے رطل کا وزن ۳۴ تولہ اور ڈیڑھ رتی کے برابر قرار دیا ہے۔

☆ دینار اور مثقال کا وزن ایک ہے بالفاظ دیگر یہ دونام ہیں ایک مسمی کے اور ایک مقدار کے لیے، دینار سو جو کا ہوتا ہے اور یہ پورے ساڑھے چار ماشے کا بنتا ہے۔

☆ ایک درہم کا وزن ستر جو ہے اوزان مروجہ میں درہم کی مقدار تین ماشہ ایک رتی دو جو ہے بعض فقہاء اس میں تھوڑا اختلاف بیان کرتے ہیں مظاہر حق میں ہے درہم تین ماشہ ایک رتی اور پانچویں حصہ رتی کا ہوتا ہے (ریاض السنن ج ۲ ص ۱۳۳، جواہر الفقہ جلد سوم ص ۴۰۴)

صاع کا وزن اور صدقۃ الفطر کا مقدار

یہ مسلم اور متفق علیہ ہے کہ صدقہ الفطر کی مقدار گندم سے نصف صاع، جو اور کھجور سے ایک صاع ہے بیان سابق سے معلوم ہوا کہ صاع کوفی کا وزن ۲۷۰ تولہ، نصف صاع ۱۳۵ تولہ ہے اور اسی تولہ سیر کے حساب سے تین سیر چھ چھٹا نک کا پورا صاع اور ڈیڑھ سیر تین چھٹا نک کا نصف صاع ہوا، نیز مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ ص ۴۱۲، اور دار العلوم زکریا افریقہ کے مفتی رضاء الحق صاحب نے فتاوی دار العلوم زکریا ج ۳ ص ۲۲۹ میں رسالہ الطـــائف والظـرائف حصہ دوم ص ۱۲ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اول صدر مدرس دار العلوم دیوبند کے پاس تھا جس کی مسلسل سند حضرت زید بن ثابتؓ کے مد تک (جوانہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مد سے ناپ کر بنایا تھا) پہنچتی ہے اس کو مولانا تھانویؒ نے دومرتبہ بھر کر وزن کیا (کیونکہ نصف صاع دو مد کا ہوتا ہے) تو ۸۸ تولہ کے سیر سے ۱/۲، ۱ ، ۱/۲، ۱ چھٹا نک ہوا تھا، اس حساب سے نصف صاع کا وزن ایک سو چالیس تولہ تین ماشہ، جو کہ ۸۰ تولہ کے سیر سے پونے دو سیر بنتا ہے۔ احتیاط اسی میں ہے کہ اسی تولہ کے سیر سے پونے دو سیر گندم ایک صدقۃ الفطر میں نکالے جاویں (اوزان شرعیہ ص ۳۸)

فقہ اکیڈمی انڈیا کے ڈائریکٹر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے اکثر ارباب افتاء کی رائے مفتی شفیع صاحب کی رائے کے قریب ہے (کتاب الفتاویٰ ج ۳ ص ۳۶۲) یعنی جدید حساب سے جب ایک تولہ ۱۱.۶۶۴ گرام کے برابر ہو تو ۱۴۰ تولہ ۱.۶۳۲۹۶ کلوگرام ہوگا۔ نیز علامہ تھانویؒ نے لکھا ہے کہ احتیاط پورے دو سیر یا کچھ زیادہ دینے میں ہے کیونکہ زیادہ دینے میں کچھ حرج نہیں بلکہ بہتر ہے (بہشتی زیور ص ۲۴۰)

چاندی اور سونے کا نصاب

یہ متفق علیہ ہے کہ چاندی کا نصاب دوسو درہم اور سونے کا نصاب ۲۰ مثقال ہے لیکن ان دونوں نصابوں میں

مولانا عبدالحئی لکھنویؒ اور قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ کے درمیان اختلاف ہے، مولانا لکھنوی کی تحقیق کے مطابق جو عمدۃ الرعایۃ میں مذکور ہے کہ نصاب فضہ (چاندی) ۳۶ تولے اور نصف ماشہ ہے اور نصاب ذھب (سونا) ۵ تولہ اور ڈھائی ماشہ ہے لیکن ہمارے مشائخ کے نزدیک اس تحقیق کے مقابلے میں مولانا قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ کی تحقیق صحیح ہے آپ کی تحقیق کے پیش نظر سونے کی نصاب ۱/۲ ۷ تولہ اور چاندی کی نصاب ۱/۲ ۵۲ تولہ ہے (جواھر الفقہ ج۳ ص ۳۹۶، ریاض السنن للروحانی االبازیؒ ج۲ ص ۱۳۳)

مقدار اوقیہ اور مقدار وسق

اوقیہ اور وسق کی مقدار بھی معلوم کرنا ضروری ہے کیونکہ کتابوں میں اس سے بھی بحث ہوتی ہے، مقدار اوقیہ ساڑھے دس تولہ اور مقدار وسق پانچ من اور ڈھائی سیر ہے، ایک من چالیس کلو کے برابر ہے یہ وہ من ہے جو رائج الوقت ہے، اور بعض کے نزدیک شرعی من سے مراد مد ہے اور مد صاع کا ربع ہے (ریاض السنن ج۲ ص ۱۳۳)

نقشہ جدید اعشاری نظام

ایک رتی	۱/۲ ۱۲۱ ملی گرام
دس رتی	۱۲۱۵ ملی گرام
۹۶ رتی	۱۱۶۶۴ ملی قدیم تولہ ۹۶ رتی کا ایک تولہ موجودہ زمانہ کے دس گرام کے تولہ سے ایک تولہ ایک گرام ۶۶۴ ملی گرام ہوگا
ایک ماشہ	۹۷۲ ملی گرام
۱۲ ماشہ	۱۱۶۶۴ ملی گرام ایک تولہ
۱۳۵ تولہ	۱۵۷۴ گرام ۶۴۰ ملی گرام

خلاصہ یہ ہے کہ اکابر کی تحقیق کے موافق صدقۃ الفطر کی مقدار تقریباً پونے دو سیر بنتی ہے یعنی اسی تولہ سیر کے حساب سے ۱۴۰ تولہ اور جدید حساب کے مطابق ۱.۶۳۲۹۶ کلوگرام بنتا ہے نیز پونے دو سیر کی جگہ پونے دو کیلو یاد رکھنا بھی آسان ہے اور آج کل اکثر ممالک میں سیر نہ ہونے کی وجہ سے پونے دو سیر کی مقدار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے لوگوں کو پونے دو کلو بتلایا جائے، بعض اکابر جیسے مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کی تحقیق مذکورہ تحقیق کے خلاف ہے لیکن ہم نے اکثر اکابر اور مفتیان کرام کے قول اور تحقیق کو ترجیح دی ہے (دارالعلوم زکریا ج۳، ص ۲۳۲)

مفتی عمر منصور رحمانی
دارالعلوم رحمانیہ مردان

اسماء والقاب میں غلواور مبالغہ آرائی: ایک منکر

جوں جوں معاشرہ دور رسالت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، یوں ہی گمراہی، تاریکی اور منکرات اپنے دبیز پردے پھیلاتے جارہے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے حمایت کرنے والوں میں بھی اضافہ کرتے رہتے ہیں، افراد کی کثرت جب ایک حد تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد ایک بالکل واضح اور بنیادی غلطی بھی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہے اور معاشرے کے زیادہ تر افراد اس کو غلطی ماننا تو درکنار ایسا کہنے کی جسارت کرنے والوں کی طرف کان لگانے کی بھی تکلیف گوارانہیں کرتے جب وہ غلطی معاشرے کے گلے کا زیور بن جاتی ہے تب اس کے حسن آرائی کے لئے عجیب وغریب دلائل کا سہارا لیا جانا شروع ہوجاتا ہے۔

انہی غلطیوں میں سے ایک غلطی ''کسی کے القاب میں غلواور حد سے زیادہ مبالغہ آرائی'' بھی ہے، یادرہے کہ کسی فرد و قوم کے واقعی صفات و کمالات کا اظہار کرنا شرعاً کوئی بری چیز نہیں، بلکہ ضرورت کے وقت کسی کے واقعی صفات کا اظہار کرنا ضروری بھی قرار پاتا ہے اور ان جیسے مواقع پر کسی کے واقعی صفات بیان کرنے میں بلاوجہ بخل سے کام لینے کو مفسرین کرام نے ''عمل تطفیف'' میں سے شمار کیا ہے جو سیدنا حضرت شعیب علیہ السلام کے قوم کی نمایاں بیماری تھی اور اس وجہ سے ان کو عذاب الٰہی سے دوچار ہونا پڑا، قرآن کریم میں بارہا اس عمل کی مذمت کی گئی ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر بیان القرآن میں یوں رقم طراز ہیں:

> مدلول نص پر اس کو قیاس کیا جائیگا جس میں اکثر اہل علم مبتلا ہیں کہ دوسرے اہل فضیلت کے اس حق کے تنقیص کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو توقیر اور اظہار فضیلت کا معاملہ کرنا چاہئے، نہیں کرتے (تفسیر بیان القرآن، ج۲ص۴۲)

اس لئے کسی کے حقیقی اور واقعی صفات بیان کرنے میں بذات خود کوئی مضائقہ نہیں، لیکن تمام کاموں کی طرح یہاں بھی حد اعتدال پر کھڑا رہنا ضروری ہے، حد سے زیادہ مبالغہ آرائی اور کسی کے واقعی صفات سے بڑھ چڑھ کر صفات والقاب بیان کرنا غلواور ایک ایسا جرم ہے جس کی دین فطرت میں کوئی اجازت نہیں ہے۔

خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بند کھولنے سے اپنی امت کو روکے رہنے کی عملی تدابیر اختیار فرمائی تھی، امام بخاری رحمہ اللہ تعالی اپنی سند کیساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا:

عن ابن عباس سمع عمر رضی اللّٰہ عنہ یقول علی المنبر: سمعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: لا تطرونی کما أطرت النصاری ابن مریم فإنما أنا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ (البخاری: ح، ۳٤٤٥)

میں نے حضو صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ (یعنی حد سے زیادہ تعریف نہ کرو) جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بڑھایا تھا، میں تو بس خدا کا بندہ ہو لہٰذا آپ کہو کہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

یہ حدیثِ مبارکہ اس باب میں راہ اعتدال کا بہترین نمونہ ہے ایک طرف تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنی مدح وصفت میں حد سے زیادہ مبالغہ آرائی سے منع فرمایا اور عیسائیوں کی مثال دیکر اس عمل کی مزید شناعت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کیونکہ مخاطب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دل تشبہ بالکفار کی نفرت سے معمور تھے، اور دوسری طرف اپنی واقعی اور عظیم صفت کا بھی اظہار فرمایا کہ میں اللہ تعالی کا بندہ اور رسول ہوں۔

ان جیسی احادیث کی بناء پر اس امت کے سلفِ صالحین کا یہ حال رہا تھا کہ وہ کسی کے تعریف اور اس کے لئے القاب استعمال کرنے میں پورے احتیاط سے کام لیتے تھے، اگر کوئی ان کے حق میں اس طرح غلو اور مبالغہ کا مظاہرہ کرتا تو بغیر کسی رعایت کے اس کی پوری حوصلہ شکنی کرتے تھے، امام نووی رحمہ اللہ کا مقولہ مشہور ہے کہ ان کے مختلف کارناموں کی وجہ سے لوگ ان کو محی الدین کے لقب سے یاد کرتے تھے اور یہ لقب اس زمانے میں ہی کافی مشہور ہو گیا تھا لیکن جب کوئی سامنے اس کی جرأت کرتا تو اس پر غصہ ہوتے اور بار بار یہ کہتے کہ جو کوئی مجھے محی الدین کہے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔

علامۃ حصکفی رحمہ اللّٰہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ وقت میں جو صفات موجود نہ ہوں اس کے ساتھ اس کو متصف کرنا مکروہ تحریمی یعنی ناجائز ہے۔

ویکرہ تحریماً وصفہ بمالیس فیہ (الدر المختار : ج۲ ص۱٤۹)

جو صفات اس میں موجود نہ ہوں، اس کو بیان کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

یہ حکم صرف بادشاہ کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ ایک عمومی ضابطہ ہے کہ کسی کے غیر واقعی صفات کے ساتھ اس کی تعریف کرنا شرعاً جائز نہیں، بادشاہ و گدا کا اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے مشہور مالکی عالم علامہ ابن الحاج مالکی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب المدخل میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی اور اپنی عادت کے مطابق اس مبالغہ آرائی کے نقصانات، اس حوالہ سے سلف صالحین کے اقوال وواقعات وغیرہ نقل فرمائے ہیں، بحث کی بالکل ابتداء میں وہ لکھتے ہیں:

> عالم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بدعت سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے جو اتنی عام ہوگئی ہے کہ کم ہی کوئی چھوٹا بڑا اس سے محفوظ ہوگا، اس سے مراد لوگوں کا ایسے نئے نئے نام رکھنا ہے جو پہلے لوگوں میں (بالکل) رواج نہیں پائے تھے، یہ شریعت کے بالکل خلاف ہے جیسے فلان الدین، فلان الدین، سب سے پہلے علماء کے لئے اپنے آپ کو اس سے بچانا ضروری ہے (المدخل، ج۱ ص ۹۱ تا ۹۶)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اگر کسی کے سامنے اس کی ایسی تعریف کی جائے یا ان کو ان جیسے مبالغہ آرائی پر مشتمل القاب سے نوازا جائے تو اولاً نرمی اور حکمت سے اس کو سمجھائے اور مسئلہ کی حقیقت اس پر واضح کرے کہ ایسی تعریف اور القاب سے کسی کو نوازنا شریعت میں درست نہیں، اگر اس کے باوجود وہ نہ رکے تو کم ازکم اتنا کرے کہ جہاں کوئی دینی ضرورت نہ ہو تو ان جیسے القابات کے ساتھ پکارتے وقت کوئی جواب نہ دے، خصوصاً دینی تقریبات کے موقع پر تو اس کا اور اہتمام ضروری ہے کیونکہ ان تقریبات کا بڑا مقصد ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اگر کوئی اس کے سامنے ایسے القابات ذکر کرے تو اس کو نرمی کے ساتھ سمجھائے اور منع کرے اور اس کو تنبیہ کرے کہ اس طرح صفات بیان کرنا شریعت میں ممنوع ہے، اسی طرح اگر کوئی اس قسم کے لقب سے اس کو پکارے تو اس کو بھی مسئلہ سمجھائے ورنہ کم ازکم دوسری مجالس میں ان جیسے القابات کے ساتھ پکارنے والے کو کوئی جواب نہ دے، یہاں تک کہ وہ جائز نام سے پکارے، کیونکہ اس مجلس میں تو اس عالم کے ذمہ اس منکر پر زبانی نکیر اور نرمی سے لوگوں کو سمجھانا واجب ہو چکا ہے وہ اسی لئے تو بیٹھا ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ان القابات میں ''تزکیہ'' بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ شریعت کی خلاف ورزی کا مجرم ہو جائیگا (المدخل، ج۱ ص ۹۱ تا ۹۶)

برصغیر کے ربانی علماء کرام کا بھی یہی وتیرہ رہا، دارالعلوم دیوبند اور اس کے عظیم بانین، مدرسین اور چہکتے مہکتے فضلاء کرام کے تاریخ سے کون ناواقف ہے؟ مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے آسمان علم وعمل کے تابندہ ستاروں کے کمالات کس کو نہیں معلوم، اپنے زمانے میں یہ تمام حضرات میادین علم وعمل کے ایسے جامع تھے کہ کم ازکم برصغیر میں اللہ تعالی نے اپنے دین کے تحفظ وبقاء اور اس کی نشر واشاعت کے لئے ان کو بجا طور پر چنا تھا، لیکن اس کے باجود القاب کے سلسلہ میں ان حضرات کے ہاں مکمل سادگی تھی، تاریخ نے ان کو جو القاب دیے ہے وہ اگر چہ بالکل بجا ہے لیکن یہ حضرات اپنے زمانے میں اس سے بالکل ناآشنا تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں حجۃ الاسلام، قطب العالم اور شیخ الہند کے القاب استعمال نہیں ہوتے تھے نہ ہی ان

القاب کے نعریں لگانے کا کبھی موقع ملا، بلکہ سب ''مولوی صاحب'' ہی تھے، کسی کو بہت ہی ممتاز کرنے کی ضرورت پڑتی تو زیادہ سے زیادہ ''بڑے مولوی صاحب'' تک ہی اس کی ترقی ہوتی تھی۔

ایک طرف تو شریعت کا یہ حکم اور اکابر واسلاف کے یہ تصریحات ہیں اور دوسری طرف ہمارا افسوسناک طرز عمل ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات پر کہ ہمارے دینی حلقہ ہی میں یہ مرض کچھ زیادہ ہی برگ وبار دکھا رہا ہے، اگر کسی چھوٹے سے دینی تقریب کا اشتہار دیکھے تو اس پر بھی اتنے بلند وبانگ القاب لکھے ہوتے ہیں کہ خالی الذہن آدمی محسوس کرتا ہے کہ آج پوری دنیا کے علم وعمل کا سیلاب یہی امڈ آرہا ہے، بہت سی جگہوں پر تو شیخ الحدیث، شیخ التفسیر، متکلم اسلام، حجۃ اللہ فی الارض، فقیہ عصر، قطب عالم، عظیم سکالر اور علامہ وقت وغیرہ القاب ایسے ضروری جزء سمجھے جاتے ہیں کہ جس کے بغیر تعریف ادھوری ہی رہتی ہے اور لفظ ''علامہ ومولانا'' کا تو کچھ نہ پوچھو، اس میں تو اتنی فیاضی سے کام لیا جاتا ہے کہ درس نظامی کے فاضل کے لئے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ان میں بہت سے القابات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جس شخص کے لئے وہ استعمال کئے جاتے ہیں، اس نے ان کی ہوا بھی نہیں سونگھی ہوتی، عام طور پر اس مبالغہ آرائی کی وجہ یہ پیش آتی ہے کہ ناظرین کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تر توجہ حاصل کی جاسکے، چنانچہ بعض ذمہ دار لوگوں کی طرف سے ایسے اعذار سامنے آتے رہتے ہیں، لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ کیا اس مقصد کے حصول کا یہی واحد ذریعہ ہے؟ اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ کوئی اتنا بڑا مقصد بھی ہے جس کے لئے ناجائز ذرائع کا سہارا لیا جاسکے؟

اگر کوئی شخص بازار میں بیٹھ کر گاہک بڑھانے کے لئے اپنی چیز کی ایسی تعریف کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہ ہو تو اس کو غش کہا جاتا ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واضح ہے کہ جو کوئی ایسا کرے وہ ہم میں سے نہیں، حالانکہ دکاندار کے مدح سرائی سے صرف ایک گاہک کا تھوڑا بہت نقصان ہوتا ہے، تو دینی تقریبات ومجالس کے اشتہارات میں اس طرح غیر واقعی صفات والقاب بیان کرنا کیونکر غش میں داخل نہ ہو، جبکہ یہاں ایک نہیں بلکہ سینکڑوں افراد اس غلط اعتماد کی وجہ سے دینی نقصان کا شکار ہوسکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ القاب وصفات کے سلسلہ میں صرف اتنی ہی سخاوت کی شرعاً گنجائش ہوسکتی ہے جو حقیقت اور واقع کے مطابق ہو، واقعی صفات سے بڑھ چڑھ کر القاب دینا ایک منکر ہے جس پر نرمی وحکمت کے ساتھ نکیر کرنا ضروری ہے، جن شخصیات کے حق میں ایسی مبالغہ آرائی کی جاتی ہے، ان کے لئے خاص طور پر اس منکر کو ختم کرنے کی کوشش کر لینی چاہئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زندہ جاوید سنت پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کا عموماً اور اپنے حلقہ اعتماد کو خصوصاً اس جیسی مبالغہ آرائی سے باز رکھ لینا چاہئے، اللہ تعالیٰ ہم کو سیدھی راہ پر چلائے۔

مفتی ثناء اللہ

دارالعلوم رحمانیہ مردان

عیسائیت اور بدھ مت کی عقیدہ تثلیث کا تقابلی جائزہ

قرآن مجید کی آیات مبارکہ اور تاریخ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ عقیدہ تثلیث اور عیسائیت کے دوسرے باطل عقائد اصل نصرانیت میں نہیں تھے، بلکہ یہ عقائد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی کے کئی برس بعد وقوع پذیر ہوئے، قرآن مجید کی آیات مبارکہ کی تفسیر عصر حاضر کی جدید تحقیقات کی روشنی میں دیکھی جائے، تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عقیدہ تثلیث کی جڑیں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے مختلف بت پرست ادیان میں رائج تھیں، جن میں قدیم مصری فرعونی مذہب، یورپی مذاہب، یونانی فلسفی مذہب، ہندومت اور بدھ مت شامل ہیں، زیر نظر مضمون میں عیسائیت اور بدھ مت کی عقیدہ تثلیث میں مماثلت کا تحقیقی اور تقابلی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

عیسائیت میں عقیدہ تثلیث کا تعارف

عقیدہ تثلیث کا تصور اگر چہ قدیم ادیان میں بھی پایا جاتا تھا، مگر عیسائیت میں یہ عقیدہ یونانی فلسفے اور بدھ مت کی تثلیث سے متاثر ہو کر آئی (۱) عیسائی اپنی روح اور اصل کے اعتبار سے اگر چہ توحید کے قائل ہیں، لیکن ایک خدا کو تین حصوں (باپ، بیٹا اور روح القدس) میں منقسم کر کے اس توحید کو عقیدہ تثلیث (Trinity) سے تعبیر کرتے ہیں (۲) باپ سے مراد خالق اور خدا تعالی کی تنہا ذات ہے، یہ بیٹے کی وجود کے لیے اصل ہے جب کہ بیٹے سے مراد صفت کلام ہے جو خدا کی ماہیت میں اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے، روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات ہے، جو ایک الگ جوہری وجود رکھتا ہے، اور باپ اور بیٹے کی طرح قدیم ہے (۳)

خلاصہ یہ کہ خدا تین شخصیتوں پر مشتمل ہے، جس میں ایک خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں، خدا کا صفت

کلام، جسے بیٹا کہتے ہیں، اور خدا کی صفت حیات، جسے روح القدس کہا جاتا ہے، ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے، لیکن یہ تینوں مل کر تین خدا نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی خدا ہیں (۴) عقیدہ تثلیث کا تصور کچھ فرق کے ساتھ بدھ مت میں بھی پایا جاتا ہے جسے ''تری کایا'' کہا جاتا ہے۔

بدھ مت میں ''تری کایا'' کی اہمیت

غیر سامی مذاہب میں بدھ مت کو بڑے مذاہب میں شمار کیا جاتا ہے، بدھوں کے عقائد میں اہم عقیدہ "تری کایا (Tri Kaya)" یعنی تثلیث ہے، ''تری'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی تین کے ہے اور ''کایا'' سے مراد'' تصور'' یا '' قانونی وجود'' ہے، اس عقیدہ کے مطابق گوتم بدھ جو زمین پر نمودار ہوا تھا وہ ایک غیر مرئی اور ابدی شکل کا مالک بھی تھا، جو صفتِ علم کے ذریعہ ظاہر ہوا تھا، یہ صفت علم مہایان فرقے میں اصول کے طور پر قبول کر لی گئی تھی، بدھ مت کے اس مشہور فرقے کے مطابق بدھ کی صورت ان تین صورتوں میں ظاہر ہوئی، وہ صورتیں یہ ہیں۔

☆ پہلی صورت سے مراد بدھا کی ظہورِ دھرم ہے اس سے مقصود دنیا کی عارضی نمو کے پیچھے ایک دائمی اور غیر فانی شئے کا وجود ہے۔

☆ دوسری صورت سے مراد دھرم کایا ہے کہ جب اپنی ذات کا بدھا کسی دوسری شکل میں ظاہر کرنا چاہتا ہے، تو کوئی نیا روپ دھار لیتا ہے۔

☆ تیسری صورت سے مراد سمجھوک کایا ہے، جس کے لفظی معنی جسم رحمت کے ہیں، یعنی خدائی وہ صفت رحمت جو بدھا میں جاگزیں ہوئی اور گوتم کی معرفت اس کے پیروکاروں میں کام کرتی رہی، اس سے مراد وہ قوت ہے، جو بدھ کی محافظ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات فانی اور حادث ہے اس کے پیچھے ایک خالق موجود ہے، جو ساری مخلوق کو پیدا کر کے خود ایک مخلوق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کائنات میں بدھا کی صورت میں عام امور کے انجام دینے کے لیے دنیا کی نگران اور اس کا محافظ ہے (۵)

بدھ مت میں "تری کایا" کا عملی شکل

بدھ مت میں تین بدوہستو اؤں کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان کی پرستش کی جاتی ہیں:

☆ میٹریا (Maitraya) کے معنی رحم دل ہیں، ان کے عقیدے میں گوتم بدھ پانچ ارب کروڑ سال کے بعد اس دنیا میں پھر آئیں گے اپنے اصول و تعلیمات کی اشاعت کریں گے (۶) میٹریا وجود کے لیے بہت سے پتھروں کے بت تیار کیے جانے لگے اور اس کی مورتی اس طرح تیار کی

جاتی کہ ایک موٹا تازہ آدمی ہنستا ہوا، تمام آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہے اور اس کے ہاتھوں میں گلدستہ ہے، جس کا ہر ہر پھول ہزار سال کو ظاہر کرتا ہے، اور دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا ہوتا ہے جس میں بہت سی عمدہ عمدہ چیزیں ہوتی ہیں جو اس دنیا میں آنے کے بعد لوگوں میں تقسیم کی جائیں گی (۷)

☆ منجوسری (Menjusri) یہ بدھستوا بدھ مت میں بہت اہم ہے جس کے لفظی معنی حیرت انگیز خوشی اور مبارک بادی کے ہیں، یہ عقل وخرد کا مجسمہ ہوتا ہے اس کا بھی ایک اہم بت تیار کیا جانے لگا ہے اس کی پیشانی پر پانچ بل دکھلائے جاتے ہیں جن سے گوتم کی عقول خمسہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے، کبھی یہ گوتم بدھ کا نواں پیشرو سے پکارا جاتا ہے اور کبھی اس کا چہیتا شاگرد اور پیارا بیٹا بتلایا جاتا ہے، لیکن بدھ ہستواؤں میں اس کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے (۸)

☆ اولو کیسٹسوارا (Avalokistesrara) اولوکیٹا (Avalokita) یہ سب سے زیادہ محترم بدھ ہستوا ہے جس کی عبادت دور دور علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے اولوکیسٹسوارا رحم اور مہربانی کا مجسمہ ہے، انسانیت کو مصائب آلام سے بچانے کے لئے ہر وقت سرگرم عمل ہے جو شخص اس پر اعتماد کرتا ہے اس کی دست گیری میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کے لئے تیار رہتا ہے (۹) اولوکیسٹسوارا کی پرستش برصغیر ہندوپاک میں تیسری سے بارہویں صدی عیسوی تک بہت زیادہ تھی (۱۰)

تری کایا اور عقیدہ تثلیث میں مماثلت: محققین کے آراء

علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں: بدھا کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ''وشنو'' معبود ہندی تری مورتی کا ایک اہم رکن ہے، جو کئی بار انسانی جسم میں دنیا اس لیے آیا ہے کہ اس دنیا کو گناہوں اور شرور سے پاک کرے، جب کہ یہی روح نویں بار گوتم بدھ کی شکل میں آیا تھا (۱۱) فابر (Faber) اپنے کتاب (The origin of Heathen idolatky) میں لکھتے ہیں، جس طرح ہندوؤں کے ہاں تین اقانیم سے مرکب ایک معبود ہے اسی طرح یہ عقیدہ گوتم بدھ کے پیروکاروں میں بھی ہے وہ کہتے ہیں، کہ بدھا الہ اور معبود ہے اور وہ تین اقانیم سے مرکب ہے (۱۲) دافس (Davids) اپنے کتاب Buddhism میں لکھتے ہیں، چین اور جاپان کے رہنے والے بدھ مت کے پیروکار تین اقانیم (اجزاء) سے مرکب معبود کو مانتے ہیں (۱۳)

عیسائیت اور بدھ مت میں تثلیث کا تقابلی مطالعہ

عیسائیت میں عقیدہ تثلیث حقیقت میں ہندوستان کے قدیم مذاہب سے لیا گیا ہے، جن میں ہندومت کی طرح بدھ مت بھی ہے کیونکہ وہ ایک ہی بدھا کو معبود مان کر اس کے بارے میں اس بات کے قائل ہیں کہ وہ تین اجزاء سے مرکب اور ان کے نزدیک ان تین اجزاء سے مراد بدھا کے تین تصورات ہیں، جنہیں بدھ مت میں کائنات کا حقیقی منبع تصور کیا جاتا ہے، درحقیقت تثلیث تین اجزاء سے مرکب ایک الٰہ کا نام ہے، جیسا کہ عیسائیوں کے عقیدے میں خدا تین اجزاء یعنی باپ، بیٹے اور روح القدس سے مرکب معبود کا نام ہے۔

واضح رہے کہ عقیدہ تثلیث صرف عیسائیوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اکثر بت پرست ادیان میں ایک خاص قسم کی ثلیثی عقیدہ کا رواج تھا، جو عیسائیت کی حقیقی روح کو بگاڑ کر بت پرست ادیان سے مستعار لی گئی، شرکی تصورات کو توحیدی لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی گئی، گذشتہ بت پرست ادیان پر لکھی گئی مغربی تحقیقات اور آج کے دور میں دریافت کی گئی مورتیوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عیسائیت کی موجودہ شکل اصل میں یہودی ساہوکاروں کی ایجاد ہے، یہ وہی الٰہی دین باقی نہیں رہی، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کر کے بنی اسرائیل کا نجات دہندہ دین قرار دیا تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ موجودہ عیسائیت درحقیقت دین الٰہی نہیں، بلکہ راہبوں کی زبانی جمع خرچ ہے، جس کے حقانیت کی کوئی دلیل نہیں، مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ان آیات مبارکہ کی تشریح بھی واضح ہوگئی جس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیت اور عیسائیت کے عقائد کو ایک طرف ان کے ہاتھوں بنا ہوا دین ٹھہرایا اور دوسری طرف اسے مشرکین کے عقائد کے مشابہہ قرار دیا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وقالت الیهود عزیرابن الله وقالت النصاری المسیح ابن الله ذلك قولهم بافواههم یضاهؤن قول الذین کفروامن قبل (١٤)

یہود کہتے ہیں کہ عزیر (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں، پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے، یہ بھی انہیں کی ریس کرنے لگے ہیں۔

اس آیت مبارکہ کی تشریح میں علامة وهبة الزحیلی فرماتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے موجودہ عقائد گذشتہ امتوں کی طرح ہیں، جس طرح وہ امتیں بت پرستی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، عیسائیت اور یہودیت بھی ان عقائد کو اختیار کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوں گے، جیسے ہندومت، بدھ مت، زرتشت، قدیم فرعونی مذاہب اور یونان و یورپ کے ماننے والے جن باتوں کے قائل تھے آج کی عیسائی دنیا بھی ان باتوں کو مانتی ہے (۱۵)

خلاصہ

اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ میں عیسائیت کے عقائد کو کفری عقائد کہا گیا ہے، ان آیات واحادیث کی تطبیق سے آج کل کی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد دوسرے بت پرست ادیان سے مستعار لی گئی، ان عقائد میں سرفہرست تثلیث ہے، یہ عقیدہ جس طرح عیسائیت میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے، ایسے ہی بدھ مت میں بھی ''تری کایا'' کا عقیدہ ایک لازمی عقیدہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عیسائیت اور بدھ مت میں دونوں اس عقیدہ میں مماثل ہے، جس سے عیسائیت کے عقیدہ تثلیث کا غیر حقیقی ہونا بصراحت ثابت ہوتا ہے۔

مصادر ومراجع

(۱) دائرۃالمعارف القرن العشرون، الرابع عشر والعشرین، محمد فرید وجدی، مادہ:ثلث، ج ۲ ص ۷۶۵،۷۶۱، دارالفکر بیروت، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(۲) محاضرات فی مقارنات الأدیان الدیانات القدیمة، امام أبو زهرة، ج۱ ص۲۹، دارالفکر العربی بیروت، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(3) What Is Christianity?, Muhammad Taqi Usmani Page: 16-19, Idara Ishaat E- Diniyat(P)Ltd.

(۴) ازالة الأوهام، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مترجم، ڈاکٹر محمد اسماعیل عارفی، ج۱ ص۴۵۰، مکتبۃ دارالعلوم کراچی، طبع وتاریخ نامعلوم۔

(۵) مذاہب عالم، احمد عبداللہ المسدوسی، ص۲۱۳۔ حقیقت دین، مولانا امین احسن اصلاحی، ص۱۱۵۔ اسلام اور مذاہب عالم، مظہر الدین صدیقی، ص۲۹۔

(6) A Dictionary Of Compartive Religion, P: 425.

(۷) انسائیکلوپیڈیا مذہب ومذاہب ص۲۴۱ (۸) انسائیکلوپیڈیا مذہب ومذاہب ص۲۴۰۔

(9) G.F.Parrinder, Worship In The World,S Religion, P: 120- 121.

(۱۰) دائرة المعارف، محمد فرید وجدی، مادہ ثلث، ج۲، ص۷۶۰ (۱۱) دائرة المعارف، محمد فرید وجدی، مادہ ثلث، ج۲، ص۷۶۰

(12) Faber, Origin of Heathen Idolater

(13) Volume, 2, P: 101-103 Faber, Origin of Heathen Idolater.

(۱۴) التوبة:۳۰

(۱۵) قال الوهبة الزحیلی: يُضَاهِؤُنَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ أی يشابهون فی كفرهم قول من قبلهم من الأمم ضلّوا كما ضلّ هؤلاء وهم الوثنيّون البراهمة والبوذيون فی الهند والصين واليابان وقدماء الفرس والمصريين واليونان والرّومان كما أن مشركی العرب كانوا يقولون: الملائكة بنات الله(التفسير المنير علامه وهبة الزحيلیؒ ج ۱۰ ص۱۸۲)

ڈاکٹر سید خالد جامعی
محقق و مفکر جامعہ کراچی

مغربی فکر و فلسفے و تہذیب کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

تہذیب کیا ہے؟

دنیا میں ہر تہذیب کی بنیاد عقائد پر ہوتی ہے، لیکن خود تہذیب کیا ہے؟ آسان الفاظ میں اس کو یوں سمجھے کہ عقائد جب فکر و عمل میں ڈھلتے ہیں تو فکر و عمل کے کچھ مظاہر سامنے آتے ہیں، یہی مظاہر تہذیب کہلاتے ہیں، اسلامی تہذیب یا عیسائی تہذیب کی اصطلاحیں انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہیں، عقائد کا اثر زندگی کے ہر گوشے پر پڑتا ہے، عقائد کے بدلنے یا خراب ہونے سے تہذیبی مظاہر بھی بدلنے لگتے ہیں۔

مغرب اور مذاہب میں عقائد کے ماخذ کا فرق

اسلامی تہذیب ایک مذہبی تہذیب ہے، عیسائی تہذیب بھی کبھی ایک مذہبی تہذیب تھی بلکہ جدید مغربی تہذیب سے قبل دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں تھیں وہ سب کی سب اپنی نہاد میں مذہبی تہذیبیں ہی تھیں، یہ صرف جدید مغربی تہذیب ہے جو سرتاپا ایک مادی تہذیب ہے اس لیے اس کے تہذیبی مظاہر بھی بہت مختلف ہیں، تمام تہذیبوں کا دعویٰ ہے کہ تہذیب وثقافت عقائد سے جنم لیتے ہیں لیکن جدید مغربی تہذیب کا دعویٰ ہے کہ عقائد خود تہذیب وثقافت کا حاصل ہوتے ہیں۔

مغرب کی مادی تہذیب کے عقائد، الٰہیات، مابعد الطبیعیات

جدید مغربی تہذیب اگرچہ ایک مادی تہذیب ہے مگر اس کے بھی کچھ ''عقائد'' ہیں جنہیں عرفِ عام میں نظریات یا تصورات بھی کہا جاتا ہے، لیکن یہ عقائد اپنی کشش اور اپنے ساتھ انسانوں کی انتہائی شدید جذباتی وابستگی سے پہچانے جاتے ہیں، چنانچہ جدید مغربی تہذیب میں آپ سرمائے کو برا بھلا کہہ کر دیکھیں یا سرمائے کے آلۂ کار آزادی کے تصور یا جمہوریت کی شان میں گستاخی کریں اہل مغرب آپ کا قتال شروع کر دیں گے اور اس قتل عام سے پتہ چل

جائے گا کہ یہ محض تصورات یا نظریات نہیں، عقائد ہیں جن کو چیلنج کرنا ''سیکولر کفر'' اور ''لبرل شرک'' کے برابر ہے اور ارتداد کی سزا موت ہے، مذہبی تہذیبوں میں عام طور پر فرد یا افراد ہی موت کی سزا کی زد میں آتے ہیں مگر جدید مغربی تہذیب کے دائرے میں ملک اور قومیں تک ارتداد کی سزا کی مستحق قرار پاتی ہیں۔

عقائد اور تہذیب کا باہمی تعلق: عقائد تہذیب کا باطن تہذیب عقائد کا خارج

عقائد اور تہذیب کا ایک باہمی تعلق یہ ہے کہ عقائد کی درستی یا خرابی کا اندازہ تہذیبی مظاہر سے ہوتا ہے اس لیے کہ تہذیب ایک اعتبار سے عقائد کا خارج ہے اور عقائد تہذیب کا باطن ہیں، کہنے کو عقائد کا معاملہ بالکل سیدھا اور صاف ہوتا ہے لیکن عقائد کے امکانات کو اجمال یا تفصیل میں سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، مثلاً توحید کا مفہوم واضح ہے لیکن ذرا شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ یا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں توحید کا بیان دیکھ لیجیے! اس بیان کو سمجھنے اور جذب کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے اور وہ بھی اس صورت میں جب ایمان کی شمع دل میں روشن ہو استادِ کامل اور فہم رسا دستیاب ہو، البتہ عقائد کے مظاہر کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے، ہم انہیں دیکھتے ہیں، برتتے ہیں، ان کا تجربہ کرتے ہیں اور انہیں محسوس بھی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تہذیبوں کا فرق و امتیاز ہم آہنگی اور تضاد و تصادم بھی لوگوں کی عظیم اکثریت کو تہذیبی سطح پر سمجھ میں آتا ہے، کہنے کو مادی تہذیب ایک آسان ترکیب ہے، مگر اس کے معنی اچھے اچھوں کو معلوم نہیں، عیسائیت تثلیث کے تصور پر کھڑی ہے اور اس کے معنی مسلمانوں کو کیا اکثر عیسائیوں کو بھی معلوم نہیں ہوں گے اور اس کے اطلاقات اور ان اطلاقات کے نتائج کا فہم تو عیسائی مفکرین کے یہاں بھی نایاب ہے، اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح معنی کے بیان اور ابلاغ کے لیے جتنی موثر ہے کوئی دوسری اصطلاح اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مغرب کو سمجھنے کے لیے کتابوں کی فہرست

اس بات کو سمجھنے کے لیے کچھ نہ کچھ پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ لیکن کیا پڑھا جائے؟ ایک ٹھوس جواب کے ذریعے ہی سوال کا حق ادا ہو سکتا ہے اور اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کے لیے کم از کم دو سو اردو اور انگریزی کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے، ممکن ہے یہ تعداد بہت زیادہ محسوس ہو؟ لیکن ان کتابوں کا مطالعہ کئے بغیر شاید ہم مغرب کے بطن میں مضمر کفر کو نہ سمجھ سکے یہ فہرست اب بھی مختصر ہے اس لیے کہ مغرب کو سمجھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، ذیل میں تہذیبوں کے تصادم، مغربی فکر و فلسفے کے ادراک، تفہیم و تسہیل، سرمایہ داری اور عیسائیت کی تاریخ، اور یونانی فلسفہ و سائنس کے عیسائیت پر مرتب ہونے والے اثرات کو سمجھنے کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ سود مند رہے گا۔

(۱) تہافتہ الفلاسفۃ: از امام غزالیؒ (م ۱۱۱۱۔۱۰۵۸) یہ اسلامی اور مذہبی فکر کے تصادم کے بارے میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی کتاب ہے، کلاسیکی یونانی فلسفہ تراجم کے ذریعے مسلم مفکرین پر گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا، تہافتہ الفلاسفۃ میں فارابی اور ابن سینا کی فلسفوں اور انہیں کی فکر کے بنیادی نکات کا جواب دیا گیا ہے، غزالی نے یونان کے زیر اثر مسلم فلسفیوں کی فکر کو ۲۰ بنیادی مسائل میں ڈھالا اور ان کا جواب لکھا۔

(۲) تہافتہ التہافہ: از ابن رشد (۱۱۹۸۔۱۱۲۶) یہ کتاب امام غزالیؒ کی تہافتہ الفلاسفۃ کا جواب ہے، (یہ کتاب غزالیؒ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی) تہذیبی فکر کے تصادم سے دلچسپی رکھنے والے اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ یونانی فکر کا حملہ کتنا شدید تھا اور امام غزالیؒ نے تہافۃ میں اس کا کیا جواب دیا اور تہافۃ پر تنقید کرنے والوں نے غزالیؒ پر کیا نقد فرمایا اس نقد کی سطح کیا تھی؟ یہ کتاب امام غزالی کے فکر پر تمام نقد کا احاطہ کرتی ہے، اس لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(۳) الرد علی المنطقین: از علامہ ابن تیمیہ، اس کتاب میں امام ابن تیمیہؒ نے یونانی فکر کے مسلم فکر پر اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، مسلم مفکرین کے یہاں یونانی اثرات کی نشاندہی کی ہے اور یونانی فکر کا رد کیا ہے۔

(۴) مکتوبات امام ربانی: کامل از مجدد الف ثانیؒ، یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے، ان مکتوبات میں اسلامی عقائد کا بیان ہے اور کئی خطوط میں اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے امتیازات اور اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیبوں کی عدم مطابقت کے بنیادی امور بیان کیے گئے ہیں۔

(۵) الرسالۃ الحمیدیۃ: از شیخ آفندی۔

(۶) الانتباہات المفیدہ فی الاشتباہات الجدیدہ: از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اس کا انگریزی ترجمہ محمد حسن عسکری نے An answer to modrensim کے نام سے کیا ہے۔

(۷) عقلیات اسلام: از مولانا مصطفیٰ خان بجنوری، یہ کتاب الانتباہات کی تسہیل و تشریح ہے، اصل رسالہ ۷۰ صفحات کا ہے اور تشریح چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، رسالہ انتباہات کی تسہیل و تشریح نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے اور عقل و منطق کی نارسائیاں نہایت عمدہ دلیلوں سے واضح کی گئی ہیں، انداز بیان سادہ اور دل نشین ہے، اگر اس کتاب کو غور سے پڑھا جائے تو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے غبار سے چندھیانے والی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، عرصہ سے اس کتاب کی اعلیٰ طباعت پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی البتہ اب مکتبۃ البشریٰ کراچی نے اعلیٰ طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی۔

(۸) الکلمة الملھمة :ازاعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ

(۹) کلیات اکبرالہ آبادی: اکبرالہ آبادی ہمارے عظیم ترین شاعروں میں ایک ہیں،تہذیبوں کے تصادم کے ابتدائی مراحل دیکھنے ہوں تو اکبر کی شاعری پڑھنا ناگریز ہے،اکبر کی عظمت یہ ہے کہ اقبالؒ تک ان کے زیر اثر رہے ہیں، اکبر کی تخلیقی سطح اقبال کے ہم پلہ ہے،فرق یہ ہے کہ اکبر نے جو بات طنز و مزاح کے پیرائے میں کہی ہے اقبال اسے ایک بڑے فکری کینوس میں اعلیٰ ترین سنجیدہ سطح پر بیان کرتے ہیں،کلیات اکبرالہ آبادی کے مطالعے کی تجویز ممکن ہے بعض طبائع پر گراں گزرے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اکبرالہ آبادی نے طنزیہ شاعری کے ذریعے تہذیب وفلسفہ مغرب کے خلاف بند باندھنے کی کتنی زبردست کوشش کی ان کے اس کام کی اہمیت شاعرِ مشرق پر خوب روشن تھی اسی لئے علامہ اقبالؒ اپنے خطوط میں حضرت اکبرؒ کو اپنا پیر قرار دیتے،ان کا شرف نیاز حاصل کرنا چاہتے اور اپنا دل حضرت اکبرؒ کے سامنے چیر کر رکھنا چاہتے تھے اقبال خود کو لاہور میں تنہا سمجھتے اور حضرت اکبرؒ کو وہ فرد واحد جانتے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے،وہ اکبر سے طویل خط لکھنے کی استدعا کرتے اور اس خواہش کو روحانی خودغرضی قرار دیتے وہ حضرت اکبرؒ کو پیر مشرق قرار دیتے تھے۔حضرت اکبر کے بارے میں اقبال نے یہاں تک لکھا کہ ''اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا قطعاً رنج نہیں بلکہ خوشی ہے خط وکتابت سے پہلے آپ سے جو ارادت وعقیدت تھی ویسی اب بھی ہے اور انشاءاللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی''،اقبال نے چند اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں بھی لکھے مگر عوام کی بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ لیا،اقبال کے خیال میں حضرت اکبر نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ (شعر) میں بند کر دیا تھا واضح رہے کہ اقبال ہیگل کو بہ اعتبار تخیل افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے تھے حضرت اکبر کے خطوط سے اقبال پر غور وفکر کی راہیں کھلتیں اس لئے اکبر کے خطوط وہ محفوظ رکھتے۔حضرت اکبر کے اشعار پڑھ کر اقبال کو شیکسپئر اور مولانا روم یاد آ جاتے تھے اقبال شکوہ جواب شکوہ پر دس پندرہ سطور کا دیباچہ ناشر کے مطالبے پر حضرت اکبر سے لکھوانے کے خواہش مند تھے۔(اقبال نامہ،ص۳۷۲،۳۷۴،۳۷۶، ۳۷۷،۳۷۸،۳۹۳،۳۹۷ یک جلدی تصحیح وترمیم شدہ،اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۵)علامہ اقبالؒ کے اِن افکار سے ''کلیات اکبرالہ آبادی'' کی اہمیت بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اقبالؒ کی ساری اردو اور فارسی شاعری اور کم از کم ضربِ کلیم جو اس اعلان کے ساتھ شائع ہوئی،ضربِ کلیم یعنی اعلان جنگ دورِ حاضر کے خلاف ''خطبات اقبال'' سے اقبال نے رجوع کر لیا تھا لہٰذا اس کا ذکر نہیں کیا گیا، اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ کے افکار جو خطبات پر عالمانہ نقد ہیں،جریدہ شمارہ ۳۳، میں بنام امالی غلام محمد کے نام سے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

(۱۱) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی: ازمولانا مودودیؒ۔

(۱۲) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل: ازمولانا مودودی

(۱۳) تفہیمات: ازمولانا مودودی۔

(۱۴) تنقیحات: ازمولانا مودودی۔

(۱۵) الجہاد فی الاسلام۔: ازمولانا مودودی

(۱۶) رسائل ومسائل پانچ حصے: ازمولانا مودودی، ان میں عہد حاضر کے متکلمانہ مسائل کا انتخاب نظر آئے گا اور جدید ذہن کے شبہات سامنے آئیں گے۔

(۱۷) مغربی فکر وفلسفے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، خطبات لاہور: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

(۱۸) A Cas Against Capitalism:Dr javid akber ansari

(۱۹) Buisness ethices in Pakistan:Dr javid akber ansari

(۲۰) Money and Banking in Pakistan:Dr javid akber ansari

(۲۱) Financial Menagement in Pakistan:Dr javid akber a

(۲۲) قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، اس کتاب کا آخری باب جدید اسلامی فکر میں اقبال کی اہمیت ص ۲۱۵ تا ۲۹۲ پر محیط ہے ڈاکٹر صاحب کا انگریزی میں غیر مطبوعہ مقالہ Iqbal's Reconstruction بھی اہمیت کا حامل ہے، فاروقی صاحب کے شاگرد خضر یاسین کی تحقیق کے مطابق خطبات پر سید سلیمان ندوی کی تنقید اور برہان فاروقی کی غیر مطبوعہ انگریزی کتاب کے الفاظ، خیالات اور افکار میں غیر معمولی توارد ہے، اس سلسلے میں جریدہ ۳۴ اور اقبال اکادمی کی کتاب ''میارا بزم بر ساحل کہ آنجا'' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

(۲۳) خطبات اقبال نئے تناظر میں: ازمحمد سہیل عمر، علامہ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا پہلا فلسفیانہ ناقدانہ جائزہ ہے اس کتاب کے ذریعے فکر وفلسفہ وتہذیب مغرب کے پیدا کردہ الحاد شکوک، شبہات، سوالات اعتراضات اور واہمات کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے عہد جدید کے اذہان میں پیدا شدہ ان سوالات کا جواب عقلیات کی روشنی میں دینے کی کوشش مختلف مفکرین اور متجددین نے کی ہے اس کا ناقدانہ جائزہ بھی سامنے آتا ہے، سہیل عمر نے اس کتاب کو برہان احمد فاروقی صاحب کے امالی قرار دیا ہے، جبکہ یہ محض اظہار عجز ہے اور سہیل عمر کی سعادت مندی اور احسان شناسی۔

(24) History of Islami Philosophy: Dr Syed Hussain Nasar

حسین نصر کی تمام کتابیں اہمیت کی حامل ہیں ان کے فکر سے ہمیں اختلاف ہے لیکن اس میں بہت اہم نکتے ملتے ہیں۔

(۲۵) خطبات اقبال ایک مطالعہ: ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی، اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ علوم اسلامی کی باقاعدہ تحصیل اور عربی زبان پر عبور کے بغیر اجتہاد اور روشن خیال افکار پیش کرنے کے دعوے دار کس قدر اغلاط کرتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔

(۲٦) قرآن اور علم جدید: ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر صاحب کے دیگر کتابوں میں بھی کام کے نکتے مل سکتے ہیں۔

(۲۷) مائیکل مین کی معرکہ آراء کتاب The Dark Side of Democracy یہ کتاب جمہوریت کے اصل چہرے سے نقاب الٹتی ہے اور تاریخی اعداد وشمار سے ثابت کرتی ہے کہ جمہوریت جہاں بھی گئی قتل و غارت گری لے کر گئی اور بیسویں صدی دنیا کی خوں خوار ترین صدی تھی، مائیکل مین نے اعداد وشمار اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ پر امن مذہب ہے اور اس کی تاریخ اجلی تاریخ ہے، جمہوریت کے تمام مداحوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے، اگر مداحان جمہوریت کی نظر سے یہ کتاب گزر جائے شاید وہ جمہوریت ترک کر دے، جمہوریت نے جس طرح خوں ریزی کی اور ایک ارب انسانوں کا قتل عام کیا، ہمارے تمام دانشور اس سے تاریخ سے ناواقف رہے۔

(۲۸) مریم جمیلہ صاحبہ کی تمام کتابیں خصوصاً اسلام ایک نظریہ ایک تحریک اور Islam and Modrenism مریم جمیلہ صاحبہ کے وہ تمام تبصرے جو مختلف کتابوں پر وہ Muslim World Book Review میں سالہا سال تک کرتی رہیں۔

(۲۹) جدیدیت: یعنی مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ از محمد حسن عسکری۔

(۳۰) وقت کی راگنی: از محمد حسن عسکری

جدیدیت مغربی فکر کے زوال اور اس کے ہولناک اثرات کی مختصر ترین تاریخ ہے جبکہ وقت کی راگنی ہمیں بتاتی ہے کہ اردو ادب کی روایت کیا ہے اور وہ مغربی روایت سے کتنی مختلف ہے؟ محمد حسن عسکری کے مندرجہ ذیل مضامین وانٹرویو وغیرہ کا مطالعہ بھی از حد مفید رہے گا۔

☆ مذہبی شاعری، یہ گفتگو لفظ میں شائع ہوئی تھی ☆ محراب اور سات رنگ میں عسکری صاحب کے شائع شدہ مضامین ☆ محسن کاکوروی کی نعت ☆ پیروی مغرب کا انجام ☆ اردو کی ادبی روایت کیا ہے ☆ بارے آموں کا کچھ بیان ہوجائے ☆ جزیرے کا دیباچہ ☆ روح کی تلاش ☆ ادب میں اخلاق

مطابقت☆ ہمارا ادبی شعور اور مسلمان☆ اسلامی فن تعمیر کی روح☆ مغرب میں مسلمانوں کے تبلیغی وجود☆ مکاتیب عسکری مرتبہ شیما مجید☆ مضامین عسکری شیما مجید☆ مشرق ومغرب کی آویزش اردو ادب میں☆ شب خون میں احمد جاوید اور آصف فرخی کا مکالمہ نیز شب خون البلاغ میں عسکری کے مضامین

(۳۱) نئی نظم اور پورا آدمی: از سلیم احمد

(۳۲) مشرق ہار گیا از سلیم احمد

نئی نظم اور پورا آدمی اردو تنقید کی نہایت ہنگامہ خیز اور اہم کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ مغربی فکر کے زیر اثر ہمارے ادب سے کس طرح پورے آدمی یا Whole Man کا بیان تحلیل ہوا اور اس کی جگہ ادھورے آدمی کا بیان در آیا۔ سراج منیر نے سلیم احمد کے تصور کو مابعد الطبیعیاتی سطح کا نظریہ قرار دیا ہے۔

مشرق سلیم احمد کی ایک طویل نظم ہے جس میں مغربی فکر کے زیر اثر مسلم معاشروں میں اقدار کی شکست و ریخت اور علامتوں کی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳۳) معرکہ مذہب وسائنس: ترجمہ مولانا ظفر علی خان (۳۴) سائنس اور مذہب: عبدالباری ندوی

(۳۵) صدق اور صدق جدید: مولانا ماجد در آبادی کے تمام رسالے، ہر رسالے میں کوئی نہ کوئی نکتہ مل جاتا ہے جس سے مغربی فکر و فلسفے کی تردید ہوتی ہے۔

(۳۶) A History of Muslim Philosophy: M M Sharif

(۳۷) عالم اسلام دجالی تہذیب کی زد میں، عبدالماجد در آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب

(۳۸) ملت اسلامیہ اور عصر حاضر کے تقاضے، عبدالماجد در آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب

(۳۹) اسلام مسلمان اور تہذیب جدید، عبدالماجد در آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب

(۴۰) بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارحین، محمد موسیٰ بھٹو

(۴۱) تعلیمات مجدد الف ثانیؒ، محمد موسیٰ بھٹو

حافظ محمد موسیٰ بھٹو ماہنامہ بیداری بھی شائع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ مختلف النوع مضامین کا گلدستہ ہے۔ اس میں مغرب، فکر مغرب فلسفہ مغرب پر شائع شدہ مضامین کتب تقاریر کا خوبصورت انتخاب پیش کیا جاتا ہے (بعض مضامین جدیدیت کی تائید بھی کرتے ہیں کیونکہ مضمون نگار علماء اور مفکر مغربی فکر و فلسفے سے واقف نہیں ہوتے لہٰذا سادہ لوحی کے باعث اخلاص سے مغرب اور جدیدیت کے بعض مظاہر کی اسلامی توثیق کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ ہوتا ہے)

(۴۲) سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت: از ڈاکٹر ظفر الحسن، یہ کتاب بتاتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں سرسید احمد خان اور مولانا حالی نے کس طرح مغربی تہذیب کی اصطلاح Nature کو غلط سمجھا اور اس کا اطلاق ادب کیا اسلام پر بھی کر ڈالا جس کے تباہ کن فکری نتائج برآمد ہوئے، یہ کتاب بتاتی ہے کہ لفظ ''نیچر'' عیسائی، ہندو، جدید مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا اور ان معنوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر اس سے زیادہ اچھی کتاب شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔

(۴۳) افکار سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

(۴۴) حیات سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

(۴۵) نقش سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

یہ کتابیں ضیاء الدین لاہوری صاحب کی چالیس سالہ تحقیقی کاوشوں کا حاصل ہے ان کتابوں میں مصنف نے موضوعات کے اعتبار سے سرسید کی فکر کو ان کی اصل تحریروں سے اقتباسات کی صورت میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب میں سرسید کی فکر کا ست سمٹ آیا ہے۔ واضح رہے کہ برعظیم پاک و ہند میں جدیدیت کے بانی سرسید ہیں (گو کہ اس کا آغاز کرامت علی جونپوری سے ہوا) لہٰذا سرسید کی فکر کو اس کے سیاق و سباق بلکہ سرسید کے اصل الفاظ میں پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ سرسید کے اثرات کا اپنے عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر اثر تھا بڑے بڑے نامی گرامی شخصیات تک سرسید کے اثرات سے بچ نہ سکے اور ان کے افکار میں جدیدیت کا زہر سرسید کی تعلیمات کا اثر ہے، اس وقت سرسید کی تمام تحریریں ان بزرگوں کے سامنے نہیں تھیں، خصوصاً سرسید کا وہ خط جس میں وہ قرآن کو کلام اللہ نہیں بلکہ کلام رسول اللہ قرار دیتے ہیں، یہ جرأت اسلامی تاریخ میں خوارج معتزلہ اور کسی گمراہ فرقے کو بھی نہ ہوئی، اگر یہ خط ان اکابرین کے سامنے ہوتا تو وہ سرسید کو رد کر دیتے۔

(۴۶) ایران سے شائع ہونے والا رسالہ [Echo of Islam [Thought سہ ماہی، مدیر محمد سلیمی

(۴۷) The decline of the west by OSWALD SPENGLER

مغربی تہذیب کے بارے میں اس کتاب کا شمار مغربی ادب کے کلاسک میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب پہلی جنگ عظیم سے قبل لکھ لی گئی تھی مگر شائع ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ یہ کتاب مغربی تہذیب کی بنیادوں، کلاسکی یونانی فکر اور مغربی تہذیب کے مرحلہ بہ مرحلہ زوال کو بیان کرتی ہے۔ اسے پڑھے بغیر مغربی فکر کے بحران کا اندازہ دشوار ہے۔ اس کا ترجمہ زوال مغرب کے نام سے اکادمی ادبیات شائع کر چکی ہے۔

(۴۸) رینے گینوں کی تین اہم کتابیں:

[A] The Reign of the quntity,

[B]Crisis of the Modern World,

[C] East and West

رینے اسلام لانے کے بعد شیخ عبدالواحد عیسیٰ کہلائے۔ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے قبل رینے کے فکر کا جائزہ جریدہ ۳۵ میں ملاحظہ کیجیے کیونکہ روایت کا مکتبہ فکر وحدت ادیان کی گمراہی کا مبلغ ہے،احمد جاوید اور تحسین فراقی نے لاہور میں مارٹن لنگز سے براہ راست پوچھا کہ آپ روایت کی جو بات کرتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں اور کوئی الحق نہیں تو مارٹن لنگز نے برجستہ جواب دیا جی ہاں آپ بالکل درست سمجھے ہیں(یہ روایت تحسین فراقی صاحب نے سید خالد جامعی سے خود بیان کی)

(۴۹) رینے کے معاصر آنند کمار سوامی کی دو کتابیں:

[A] Figure of Speech OR Figure of thought,[B] What is civilization

دوسری کتاب بتاتی ہے کہ مذہبی تہذیبوں میں لفظ تہذیب کے کیا معنی رہے ہیں اور جدید مغربی تہذیب اسے کس مفہوم میں استعمال کرتی ہے،پہلی کتاب ثابت کرتی ہے کہ جدید مغربی فکر آرٹ اور تخلیق کے تصور کو پست سے پست تر کر کے اس سطح پر لے آتی ہے جہاں انسان،حیوان اور پودوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

(۵۰) شواں کی درج ذیل کتابیں:شواں کا تعلق بھی روایت کے گمراہ مکتب فکر سے ہے۔

[A] DIMENSIONS OF ISLAM.

[B] TO HAVE A CENTER.

[C] FORGOTTEN TRUTH

فکر مغرب کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ لازمی ہے۔

[1]	Judaism and Rise of Capitalism	ZAMBAT
[2]	Sources of Self	Charles Taylor
[3]	I & Thou	Martin Boober
[4]	Being and Nothingnes	Sarter
[5]	Capitalism Shezophrenic life style	Dlues

Anti Edipus [Volume I]

Anti Platious [Volume II]

[6] Madness & Civilization Focualt

[7] Dicipline and punishment Focualt

[8] History of Sexuality [Three Volume] Focualt

[9] The Archiology of Knowledge Focualt

[10] The Birth of Clinic Focualt

[11] Contigency Irony and solidrity Richard Rorty

[12] Achieving our country Rorty Richard Rorty

[13] Objectivity Vol. I & II Richard Rorty

[14] Post Structurallism and Post modernism Madhan Surup

[15] Enlighment wake John Gray.

[16] History of Muslim thought Majid Fakhri

[17] Philosophy and Islam M. Watt

[18] Islam. A. R Gibbs

[19] Platuo, A.E. Taijlor

[20] An introduction of Greek throghts Guttehery

[21] An introduction of Greek thoughts STAC

[22] The Classics of westren philosophy [one volume.]

[23] Being & Existence

Broke کی اس کتاب کا دیباچہ ہائیڈ یگر نے لکھا ہے، یہ کتاب Being & Time کی شرح ہے اور اتنی عمدہ شرح کہ ہائیڈ یگر نے دیباچے میں لکھا کہ میرے خیال کے قریب کتاب ہے،

[24] History of Political Phiolosphy Leo Strouss

[25] The Readings of Social Sciences Luvis Martin

مغربی مصنفین ومفکرین کی درج ذیل کتابیں:

[1] BEYOND THE POSTMODERN MIND BY HUSTO SMITH.

[2] THE RISE AND FALL OF THE GREAT POWERS. BY PAUL KENNEDY.

[3] THE END OF THE HISTORY AND THE LAST MAN BY FUKUYAMA.

[4] THE WORLD IN COLLISION EDITED BY KEN BOOTH AND TIM DUNNE.

[5] HOLY WAR BY KAREN ARMS STRONG.

[6] THE ANATOMY OF HUMAN DESTRUCTIVENESS BY ERIC FROMM. [7] MUSLIMS AND THE WEST. EDITORS ANSARI ZAFFER ISHAQ AND JOHAN ESPOSITO.

فکر وفلسفہ وتہذیب مغرب کا رعب عموماً سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے بٹھایا جاتا ہے جدیدیت پسند مفکرین مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی سے بے حد مرعوب ہیں اور اس کا کوئی متبادل نہیں پاتے سوائے اس کے کہ عالم اسلام کسی بھی طریقے سے مغرب کی اس ترقی کو حاصل کرے ان مفکرین کو سائنس وٹیکنالوجی کے مباحث سے متعلق درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ ان کا خلجان دور ہو سکے اور امت ان کے افکار کی اڑائی گئی گرد سے باہر نکل سکے، یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے بھی مفید ہیں جو ابھی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے سحر سے باہر نہ آ سکے اور امت مسلمہ کی نجات فلاح فوز کا تصور سائنس کے بغیر کرنے سے عاجز ہیں، مدارس عربیہ کے طلباء اور علماء کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ بہت سے اشکالات دور کر دے گا اور مغرب کے مقابلے میں انھیں اعتماد و یقین عطا کرے گا، اس دور کا المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اعتماد و یقین کی دولت سے محرومی بھی ہمارے ساتھ ہوتی ہے، ہم اندر سے خائف ہیں اور اپنے خوف کو صرف خطابت سے چھپاتے ہیں، ہمیں یقین کی ضرورت ہے، ایسا پختہ یقین جو اس ایمان سے پھوٹے کہ مغرب باطل ہے، اسلام الحق ہے اس کے بعد یقین کی علمی بنیادیں تلاش کی جائیں لیکن یقین علم سے مشروط نہیں ایمان سے مشروط ہے۔

1. Discourse on Method and the Meditations by Rene Descartes, translated by F. E. Sutcliffe
2. Crises of European Sciences by Edward Husserl. Mathematical Principles of Natural Philosophy.
3. Science A History, by John Gribbin
4. Newton to Einstein by Ralph Baicelain.
5. A History of Science by William Dampier
6. Galileo at Work by Stillman Drake
7. Issac Newton by Rupert Hall

8. Nicholas Copernicus by Josef Rednicbi.
9. The Scientific Work of Rene Descartes by J. F. Scott.
10. The Scientific Revolution by Steven Shapin
11. Science and the Modern World by A. N. Whitehead
12. Foresight and understanding by Stephen Toulmin
13. Philosophy of Science by Alexendar Bird
14. What is this thing called science by A. F. Chalmer
15. Between Science and Metaphysics by S. Amsterdamski
16. Belief, Truth and Knowledge by D. M. Armstrong
17. Truth and Logic by A. J Ayer
18. Two Paradigms of Scientific Knowledge by D. Bloor
19. The Natural Philosophy of Galileo by Maurice Clavelin
20. Feyerabends Discourse against Method by J. Curfhoys and W. Suchting
21. On Scientific Method by J. J. Daires
22. How to defend Society against science by P. K. Fayerabend
23. Two New Sciences by Galileo Galilei
24. Philosophy of Natural Science by C. G. Hampel
25. Treatise on Human Nature by D. Hume.
26. Metaphysics and Measurement by A. Koyre
27. The structure of Scientific Revolution by T. Kohn.
28. Proofs and Refutation by Z. Lakatos
29. The logic of Scientific Discovery by Karl Popper.
30. Science and Subjectivity by Israel Scheffler

(۵۱) جمال پانی پتی کی کتاب ''جدیدیت کی ابلیسیت''

(۵۲) ادبی رسالے ''مکالمہ'' کے متفرق شمارے جن میں جدیدیت پر جمال پانی پتی اور دیگر مفکرین کے قیمتی مضامین مل جاتے ہیں۔ ''مکالمہ'' جناب مبین مرزا کی زیرادارت شائع ہوتا ہے اور جدیدیت کا سخت ناقد

لیکن نہایت علمی وتحقیقی وادبی رسالہ ہے۔

(۵۳) ضمیر علی بدایونی ''جدیدیت اور پس جدیدیت''

(۵۴) جریدہ ''روایت وتہذیب'' اور جریدہ ''روایت'' کے چھ شمارے۔ جو سہیل عمر اور سراج منیر کی زیرادارت شائع ہوئے ان میں بعض مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(۵۵) جریدہ ''اعلام'' لاہور شمارہ ۳ جس میں محمد حسن عسکری کی کتاب مغربی فکر کی گمرائیوں کا خاکہ پر جناب ڈاکٹر ساجد علی نے ''محمد حسن عسکری کا تصور روایت و مابعدالطبیعات'' کے نام سے نہایت عالمانہ نقد کیا ہے۔

(۵۶) ماہنامہ فنون میں محمد عسکری کی کتاب ''جدیدیت'' اور اس کے متعلقات پر محمد ارشاد کے ناقدانہ مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

(۵۷) غرب زدگی (فارسی) جلال آل احمد تہران۔ انقلاب ایران کے زمانے کی مقبول ترین کتاب

(۵۸) ڈاکٹر علی محمد رضوی کا ایم فل کا مقالہ

[1] Focault on Freedom[2] Methodology underlying Imam Ghazali's critique of Greek Philosphy.(مطبوعہ جریدہ ۲۹)

(۵۹) ڈاکٹر عبدالوہاب سوری کا پی ایچ ڈی مقالہ Philosophical analysis of Rawl's Theory of Justice. (مطبوعہ جریدہ ۳۴)

(۶۰) الفکر الاسلامی الحدیث وصلتُه بالا ستعمار الغربی: الدکتور محمدالبھی

(۶۱) شاہنواز فاروقی کے کالموں کا مجموعہ ''کاغذ کے سپاہی'' اور ایم اے کے لئے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ''سلیم احمد'' مغربی فکر وفلسفے کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے ''سلیم احمد'' والے مقالے میں تہذیب مغرب کی کشمکش سے ابھرنے والے بے شمار سوالات پر غور وفکر کا موقع میسر آتا ہے۔

(۶۲) قصة الایمان بین الفلسفة و العلم القرآن: مفتی طرابلس الشیخ ندیم الجسر

(۶۳) ہائیڈیگر کی درج ذیل کتابیں:

[1] Being & Time [2] Question Concerning Technology.

(۶۴) اسلام پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

(۶۵) ارکان اربعہ: ابوالحسن علی ندوی (۶۶) تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ابوالحسن علی ندوی

(۶۷) دائرۃ المعارف الاسلامیہ جامعہ پنجاب اس انسائیکلوپیڈیا میں مسلم فلاسفہ اور ان کے افکار ونظریات کے سلسلے

میں اہم معلومات مل جاتی ہیں۔

(۶۸) معتزلہ کی تاریخ زہدی حسن جاراللہ پیش لفظ الفرڈ گیوم

(۶۹) الملل و النحل: ابن حزم اندلسی، ترجمہ عبداللہ العمادی

(۷۰) الملل و النحل: شہرستانی ترجمہ پروفیسر علی محسن صدیقی

(۷۱) الفرق بین الفرق : عبدالقاہر بغدادی

(۷۲) العقل و النقل: علامہ شبیر احمد عثمانی

(۷۳) قرآن حکیم کے وہ تمام متداول تراجم اور تفاسیر جوامت مسلمہ کے مسلمہ مکاتب فکر کے ہاں رائج ہے۔

(۷۴) ٹونی کی کتاب Religion and Rise of Capitalism

(۷۵) میکس ویبر Capitalism and Protestant Ethics

(۷۶) بیرنگٹن مور Social Organs of Dictatorship and Democracy Lord and Peasent in the Making of Modren World.

(۷۷) رکسانہ لیوبن Enemy in the mirror

(۷۸) ڈاکٹر ڈیوڈ میکے Critique of Modreneity

(۷۹) جرگین ہیبر ماس The Philosophical Discourse of Modernity

(۸۰) مغربی فکر و فلسفے کے التہاب والحاد سے پیدا ہونے والے اضطراب نے عالم اسلام کے مفکرین کو کس طرح متاثر کیا اور بڑے بڑے علماء وفضلاء کس طرح جدیدیت میں ڈوب گئے اور مغرب کی چکاچوند میں بہہ گئے۔ اس کا جائزہ بھی ضروری ہے اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، علامہ مشرقی، غلام احمد پرویز، سرسید احمد خان، غلام جیلانی برق کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، جس سے مغربی یلغار کے اثرات کا اندازہ ہوگا۔ مغرب سے علمی سطح پر متاثر ہونے والے افراد کے تشکک اور تذبذب کا گہرا جائزہ لینے کے لیے علامہ اقبالؒ، احمد سعید اکبرآبادی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن (سابق سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی) اور ڈاکٹر منظور احمد (ریکٹر اسلامی یونیورسٹی) کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، اس مطالعے کے دوران یہ واضح ہو جائے گا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈاکٹر منظور احمد، غلام احمد پرویز اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے تمام متجددین اور جدیدیت پسند علماء کی فکر علامہ اقبالؒ کے خطبات کے اعادہ سے زیادہ نہیں ہے اور خطبات کی تشکیک پر اپنے فکر و نظر کی عمارت تعمیر کرنا ان تمام جدیدیت پسندوں کا طرہ امتیاز ہے۔ اور تمام جدیدیت مفکرین عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کو مذہب کے دائرے میں حل کرنیکا دعوی کرتی ہے اور اس عمل کے دوران یہ بھول جاتی ہے کہ دین اور

اس کی تمام روایات دوراز کار تاویلات کے نتیجے میں جدیدیت کی بھول بھلیوں میں نہ صرف گم ہوجاتی ہیں بلکہ اس طرح تحلیل ہوتی ہیں کہ اگلی نسل میں ان کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ مفتی عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا کی وہ تحریریں پڑھ لی جائیں جو طٰہٰ حسین جیسے بے شمار عبدہ کے شاگردوں کے الحاد کے ردعمل میں لکھی گئیں، اس ضمن میں علامہ اقبال کے خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ جاوید غامدی کی اسلام کیا ہے جو ان کے شاگرد ڈاکٹر محمد فاروق خان کے نام سے شائع ہوئی ہے، کا مطالعہ ضروری ہے (ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر جاوید اقبال ان جدیدیت پسند دانشوروں میں شامل ہیں جو نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی ان کے علمی افلاس کا عالم یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں کسی عربی فارسی کتاب کا حوالہ نہیں ملتا، مگر دین پر اعتراضات میں یہ لوگ نہایت جری ہیں) عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ سے لے کر جسٹس جاوید اقبال اور ڈاکٹر منظور احمد تک ایک بھی جدیدیت پسند مفکر نہ اسلامی علوم پر عبور رکھتا ہے نہ عربی زبان سے گہری واقفیت، لیکن سب کو اجتہاد کا لپکا ہے۔

(۸۱) اقبال شناسی: ڈاکٹر منظور احمد (۸۲) اسلام چند فکری مسائل: ڈاکٹر منظور احمد

(۸۳) نیاز فتح پوری کی خدا اور تصور خدا (یہ نگار کا خدا نمبر ہے جو سرقہ کیا گیا تھا اس سرقے کی تفصیل ماہنامہ الدعوۃ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شمارہ ۱۲، جلد پانچ میں ملاحظہ کیجیے)

(۸۴) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، من و یزداں۔ یہ کتابیں ڈاکٹر منظور احمد کے الحادی منہاج میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے ایک خطبے میں ان کتابوں کو جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں اہم مقام دیا ہے۔

(۸۵) عورتوں کے امتیازی مسائل اور قوانین حکمتیں اور قواعد، حافظ صلاح الدین یوسف

(۸۶) فکریات، ترجمہ و ترتیب تحسین فراقی

(۸۷) مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں، پروفیسر سید محمد سلیم

(۸۸) مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، پروفیسر سید محمد سلیم

(۸۹) برصغیر پاک و ہند میں غیر ملکی زبانوں کے ماہر علماء، پروفیسر سید محمد سلیم

(۹۰) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، سید قطب

ڈیکارٹ سے لے کر عہد حاضر کے عظیم فلسفی ڈیلوز تک اہم فلاسفہ کی کتابیں جس کے بغیر مغرب کا کلی ادراک محال ہے۔

(۹۱) Baruch spinoza: ETHICS

[1] Gottoried Wilhelm von Leibnize: [2] DISCOURSE ON METAPHYSICS

[3] MORADOLOGY

(۹۲) جان لاک [John Lock]

[1] AN ESSAY CONCERNING HUMAN UNDERSTANDING [3] A LETTER CONCERNING TOLERATION [3] CONCERNING CIVIL GOVERNMENT.

(۹۳) George Berkeley کی کتاب

THE PRINCIPLES OF HMAN KNOWLEDGE.

(۹۴) David Hume

[1] AN INQUIRY CONCERNING HUMAN UNDERSTANDING [2]DIALOGUES CONCERING NATURAL RELIGION.

(۹۵) Immauel Kant:

[1] CRITIQUE OF PURE REASON [2]CRITIQUE OF PRACTICAL REASON [3] CRITIQUE OF JUDGMENT [4]GROUNDWORK OF THE METAPHYSICS OF MORALS [5]WHAT IS ENLIGHTENMENT

(۹۶) George Fridrich Hegel

[1] PHILOSOPHY OF RIGHT [2] PHILOSOPHY OF HISTORY

[3]PHENOMENOLOGY OF MIND

Karl Mar Das capital (4 vols)

(۹۷) Friedrlch Nietzsche:

[1] THE BIRTH OF TRAGEDY [2] UNTIMELY MEDITATIONS [3] THUS SPAKE ZERATHUSTRA [4] THE GENEALOGY OF MORALS [5] BEYOND GOOD AND EVIL.

(۹۸) Ayer, Alfred Jules: Language, Truth and Logic.

Derrida, Jacques

[1] OF GRAMMATOLOGY. [2] WRITING AND DIFFERENCE. [3]MARGINS OF PHILOSOPHY.

(۹۹) Dewey, John

[1] RECONSTRUCTION IN PHILOSOPHY. [2] THEORY OF VALUATION.

[3] HUMAN NATURE AND CONDUCT.

(۱۰۰) Dilthey, Wilhelm: INTRODUCTION TO THE HUMAN SCIENCES.

(۱۰۱) Foucault, Michel

[1] MADNESS AND CIVILIZATION [2] THE ORDER OF THINGS [3] THE ARCHAEOLOGY OF KNOWLEDGE [4] DISCIPLINE AND PUNISHMENT

(۱۰۲) Gadamer,Hans, George: [1] TRUTH AND METHOD.

Habermas, Jurgen

[1] THE PHILOSOPHICAL DISCOURSE OF MODERNITY [2]THE THEORY OF COMMUNICATIVE ACTION (2 VOLS)

(۱۰۳) Heideger, Martin

[1] BEING AND TIME [2] QUESTION CONCERNING TECHNOLOGY.

(۱۰۴) Husserl, Edmun [1] LOGICAL INVESTIGATIONS

James, William

[1] THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE [2]PRAGMATISM

(۱۰۵) Peirce, Charles: [1] SOME CONSEQUENCES OF FOUR CAPACITIES.

(۱۰۶) Popper, Karl

[1] OBJECTIVE KNOWLEDGE [2] THE OPEN SOCIETY AND ITS ENEMIES

(۱۰۷) Rawls, John

[1] A THEORY OF JUSTICE. [2] POLITICAL LIBERALISM

(۱۰۸) Ricoeur Paul

[1] HISTORY AND TRUTH [2] THE CONFLICT OF INTERPRETATION [3] THE ROLE OF METAPHOR.

(۱۰۹) Rorty, Richard

[1] CONTINGENCY, IRONY AND SOLIDARITY [2]OBJECTIVITY, RELATIVISM AND TRUTH

(۱۱۰) Wittgensteien, Ludwigl

[1] PHILOSOPHICAL INVESTIGATION

(۱۱۱) Gilles Deleuze and Felix Guttari

[1] ANTI OEDIPUS [2] THOUSAND PLATEOUS [3] WHAT IS PHILOSOPHY.

(۱۱۲) درج ذیل مطبوعات کا مطالعہ بھی سودمند رہے گا۔

☆جریدہ ۲۲☆جریدہ ۲۳☆جریدہ ۲۴☆جریدہ ۲۵☆جریدہ ۲۸☆جریدہ ۲۹ ☆جریدہ۳۰☆جریدہ۳۲☆جریدہ۳۳☆جریدہ۳۴☆جریدہ۳۵☆جریدہ۳۶: مرتبہ، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی (۱۱۳) ماہنامہ ساحل کراچی کا خاص موضوع مغربی تہذیب فلسفہ تاریخ کا ناقدانہ جائزہ ہے اس کی تمام فائلیں سودمند رہیں گی (۱۱۴) اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں: محمد ظفر اقبال، کتاب محل لاہور (۱۱۵) اسلام اور جدیدیت کی کشمکش: محمد ظفر اقبال

(۱۱۴) مغربی فکر و فلسفے سے متعلق تعارفی مباحث، مغربی فلسفیوں کے تعارف، مغربی فلسفہ پر سرسری نقد کے لیے درج ذیل ویب سائٹس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں اٹھنے والے عصری فتنوں، متجددین کے افکار، راسخ العقیدہ علماء کے الحادی افکار سے واقفیت کے لیے بھی درج ذیل ویب سائٹس سے قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

www.falsafeh.com	www.sunna.org
fallosafah.org	pless.arabandalucia.com
www.halgheh.com	www.osraty.com
www.muslimphilosophy.com	www.khaled-alfaisal.com
www.alwaraq.net	www.lahdah.com
plato.stanford.edu	www.noo-problems.com
www.enashir.com/blogs/tarik	www.peykarandeesh.org/article
www.jozoor.net	www.caricadonya.com
books.mirror.org	www.nizwa.com
www.magiran.com	www.arabworldboks.com/articles
www.hupaa.com	www.shahnawazfarooqui.com

اس ویب سائٹ پر شاہنواز فاروقی صاحب کے تمام کالم اور علمی کام میسر ہے، مغرب پر بعض تنقیدی مضامین علماء کرام کے لیے نہایت معلوماتی اور کارآمد ہیں۔ عام لوگوں کے لیے شاہنواز صاحب کے کالم نہایت آسان اور شگفتہ زبان میں لکھے جاتے ہیں اور علمی افراد کے لیے ان کی علمی شان بھی ہوتی ہے۔

محمد اسلام حقانی
مؤتمر المصنفین اکوڑہ خٹک

کیا عروج کے لیے سائنسی ترقی ناگزیر ہے؟

عصر حاضر کے ماڈرن اور کچھ نیم ماڈرن مفکرین کا خیال ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے بغیر امت مسلمہ عروج کا سفر طے نہیں کرسکتا، اسی طرح عقلِ انسانی کے بغیر قرآن وسنت کا صحیح ادراک وتدارک بھی ممکن نہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک دور کا پیامبر تھا جو عقلیت، سائنس اور مسلمانوں کو ان امور میں قائدانہ صلاحیت عطا کرنے کے لیے آیا تھا ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قاہرہ، بغداد اور قرطبہ نے دنیا کو روشن خیالی عطا کی، لیکن اب مسلمان سائنسی پسماندگی کی وجہ سے زوال کا شکار ہے اور وہ زوال امت کی اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ گردانتے ہیں کہ مسلمان سائنسی ترقی سے پیچھے ہیں، یہی ان کا وجہ زوال بنی، دوسری بات یہ ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کو عام طور پر ایک ہی سمجھا جاتا ہے حالانکہ دونوں کے درمیان واضح فرق ہے، سائنس تو معلومات کو منطق اور تجربے پر پرکھ کر متعین قوانین کی دریافت کا نام ہے، اس کے مقابلے میں ٹیکنالوجی، معلوم شدہ سائنسی قوانین کا اطلاق کرکے ایسی اشیاء کی تیاری کا طریقہ کار ہے، جن کی مارکیٹنگ ممکن ہو اور ان اشیاء کی تیاری پر آنے والی لاگت، اس کی قیمت فروخت سے کم ہو، اگر کسی ٹیکنالوجی کے ذریعے تیار کی جانے والی اشیاء کی لاگت ان کی قیمت فروخت سے زیادہ ہو تو ایسی ٹیکنالوجی ترک کردی جائے گی، سائنس تو ایک علم کا نام ہے مگر موجودہ دور کی ''ٹیکنو سائنس'' کا گہرا تعلق سرمایہ داری کی ساتھ ہے، ٹیکنالوجی، سرمایہ داری کی اقدار اپنے ساتھ لے کر آتی ہے، اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ جن معاشروں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو عروج حاصل ہوا ان تمام معاشروں میں مذہبی، اخلاقی اور خاندانی اقدار زوال پذیر ہوگئیں، امریکی اور یورپی معاشرے اس کی واضح مثال ہیں اور اب چین بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔

تاریخ کا سب سے بڑا چیلنج اور اس کا ماڈرن جواب

تاریخ کا سب سے بڑا چیلنج جو مغربی تہذیب نے پیش کیا وہ سائنس وٹیکنالوجی کا تھا اور ہے، اس چیلنج کا جواب سرسید سے لے کر اب تک یہی دیا جارہا ہے کہ مغرب نے اب تک کی تمام ترقی سائنس وٹیکنالوجی کے طفیل کی

ہے،لہٰذا امتِ مسلمہ کوبھی اگر ترقی کے راستے پر جانا ہےاور مغرب کا مقابلہ کرنا ہے،تو ہمیں بھی سائنس وٹیکنالوجی کا وہی ہتھیار حاصل کرنا پڑے گا جومغرب کے پاس ہے۔

چیلنج کاٹھوس اورعلمی جواب

اس کے مقابلے میں دوسرے مکتبہ فکر کا خیال ہے کہ تاریخ کا مطالعہ اس بات کوغلط ثابت کرتا ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت قومیں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتی ہیں،اس سلسلے میں سب سے پہلی مثال مسلم افواج کے ہاتھوں ایران اور روم کی طاقتوں کی شکست ہے،ایران کی عظیم الشان سلطنت کے انہدام کے بعد روم کے دارِسلطنت قسطنطنیہ کی فتح نے اسباب،عسکری قوت اورٹیکنالوجی کے بجائے ایمان کو برتر طاقت ثابت کردیا۔

بعد کے تاریخ میں تاتاریوں کے عباسی سلطنت پر حملے اور قبضے نے اس مؤقف کومزید استحکام بخشا، تاتاریوں نے جب عباسی سلطنت پرحملہ کیا تو عباسی سلطنت دنیا کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی،اس سلطنت میں علم کے عروج کا یہ عالم تھا کہ اس کے بیت الحکمت میں اٹھائیس زبانوں میں ترجمہ کرنے کا انتظام موجود تھا،خود دربار میں منطق ،فلسفے اور انشاء پر بحثیں معمول کا حصہ تھیں،گھوڑوں،تلواروں اورلشکر میں عباسی سلطنت کا کوئی ثانی نہ تھا ، مگرصحرائے گوبی کے وحشی تاتاریوں نے آناً فاناً عباسی سلطنت کوالٹ کرر کھ دیا،اس زمانے کی سائنس میں عباسیوں کا عروج اورعظیم الشان مملکت کی شان وشوکت انہیں تاتاریوں کے ہاتھوں شکست سے نہ بچاسکی،تاریخ نے بتایا کہ کم تر وسائل اورسائنس سے بے گانگی تاتاریوں کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکی اور نہ ہی عباسیوں کی علمی برتری انہیں شکست سے محفوظ رکھ سکی۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ عالم اسلام نے عباسی سلطنت کی شکل میں اپنا ملک کھودیا مگر تاریخ نے یہ بھی بتایا کہ عالم اسلام نے دوبارہ تاتاریوں پرغلبہ حاصل کرکے اپنی شکست کوفتح میں تبدیل کردیا،مگر سب کچھ سائنس کی بدولت نہ ہوا بلکہ ہوا یہ کہ تاتاریوں نے بلاشبہ جنگ کے ذریعے مسلمانوں کومغلوب کرلیا مگر اسلام کے آفاقی پیغام سے شکست کھاگئےاور تاتاریوں کی بہت بڑی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا................

ع کعبےکومل گئے پاسباں صنم خانے سے

اب تاتاریوں کی عسکری قوت اسلام کی طاقت میں ڈھل گئی اور اسلام نے اپنی عسکری شکست کومحض اپنے ابدی پیغام کی قوت سے فتح میں بدل کردوبارہ عروج حاصل کرلیا،موجودہ دور کا منظرنامہ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کی فتح وشکست کبھی سائنس وٹیکنالوجی کی مرہون منت نہیں رہی،ویت نام اورامریکہ کی جنگ میں امریکہ کی تمام

تر عسکری قوت اور ٹیکنالوجی کی برتری اسے شکست سے نہ بچا سکی، اس سے قبل افغانستان پر حملہ کرنے والی برطانیہ کی چالیس ہزار افواج میں سے صرف ایک ڈاکٹر جان بچا کر واپس جا سکا، مگر کہا جاتا ہے کہ انسان نے تاریخ سے یہی سبق سیکھا ہے کہ اس نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا لہٰذا روس بھی اسی افغانستان پر حملہ آور ہوا مگر افغان جنگ نے روسی معیشت کا جنازہ نکال دیا، یہاں تک کہ اس وقت کے روسی صدر برزنیف نے افغانستان کو روس کے لیے ایک رستا ہوا ناسور قرار دے کر اس جنگ سے پسپائی اختیار کر لی، ایک بار پھر ٹیکنالوجی ہار گئی اور ایمان کو فتح حاصل ہوئی۔

اندلس کی سائنسی ترقی مگر پھر بھی شکست

سائنسی و سماجی علوم کی برتری کے باوجود مسلمانوں کی شکست کا ایک ثبوت مسلم ہسپانیہ کا سقوط ہے جس کا دردناک مرثیہ اقبال نے لکھا، آج بھی سائنس و ٹیکنالوجی کو عروج و زوال کا واحد سبب سمجھنے والے اندلس میں مسلمانوں کی سائنسی برتری کا بہت چرچا کرتے ہیں مگر مسلم اسپین کا انجام کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اسپین کے مسلمانوں کی برتری اور بلند و بالا عمارات انہیں نہ صرف یہ کہ شکست سے نہیں بچا سکیں بلکہ اسپین سے مسلمانوں کا وجود ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، آج اسپین، وہ اسپین جسے اقبال نے خونِ مسلماں کا امین قرار دیا، اسی اسپین میں جامع مسجد قرطبہ، الحمراء کے محلات اور دیگر پرشکوہ عمارات تو باقی ہیں مگر مسلمان باقی نہیں رہیں، اس کے مقابلے میں مشرق وسطی میں اسلام اور مسلمان اپنی سائنسی پس ماندگی کے باوجود زندہ و توانا رہے، اسلام کے ابدی پیغام کی قوت کے بدولت آج حضرت صالح اور ابراہیم علیہم السلام کی تعلیمات تو باقی ہیں مگر حیرت انگیز ٹیکنالوجی سے کام لے کر پہاڑوں میں گھر اور اہرام مصر بنانے والوں کا تذکرہ بھی باقی نہ رہا اور اگر کہیں ان کا ذکر ہوتا بھی ہے تو عبرت کی خاطر۔

سپر پاور کو پسماندہ مجاہدین کی ہاتھوں شکست

تاریخ کے واضح پیغام کو نظر انداز کرتے ہوئے دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ نے اپنی سائنس و ٹیکنالوجی، دولت اور عسکری طاقت کے زعم میں روس جنگ سے چور چور افغانستان پر حملہ کر دیا، اس جنگ میں تمام مسلم اور غیر مسلم ممالک نے امریکہ کی ایک دھمکی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے امریکہ کا بھرپور ساتھ دیا، اس جنگ کے تناظر میں دیکھا جائے تو ساری دنیا کے افواج ایٹمی ٹیکنالوجی کے باوجود محض ایک دھمکی میں ڈھیر ہو گئے مگر بغیر کسی باقاعدہ فوج، بڑی آبادی اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے افغان مجاہدین نے امریکہ کو سولہ سال سے ایک ایسی جنگ میں مصروف رکھا ہوا ہے جس نے امریکی فوج پر اس کی ٹیکنالوجیکل برتری کے باوجود تھکن طاری کر دی ہے اور مسلح امریکی فوج کے افسر اور جوانوں نے افغانستان اور عراق میں خودکشی کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے ہیں، اعداد و شمار بتا رہے ہیں کہ خودکشی

کرنے والے امریکی فوجی میدان جنگ میں مرنے والے فوجیوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں اور ان سے زیادہ تعداد ان سپاہیوں اور افسروں کی ہے جو نفسیاتی امراض کا شکار ہو کر ناکارہ ہو رہے ہیں، اس کے مقابلے میں افغان مجاہدین کا مورال اس قدر بلند ہے کہ وہ نیٹو فورسز کے کابل میں قائم کردہ محفوظ ترین گرین زون میں بھی کامیاب حملے کر رہے ہیں اور اپنی فتح کے بارے میں پرامید ہیں۔

سائنسی ترقی اور جرائم کا اضافہ

نسل انسانی نے اپنے آغاز سے آج تک جس ادارے کے سبب اپنا وجود قائم رکھا ہے وہ خاندان کا ادارہ ہے، ٹیکنالوجی کی تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں جہاں سائنس وٹیکنالوجی کو عروج حاصل ہوا ہے وہاں خاندان کے ادارے کو نقصان پہنچا ہے، خاندان سے وابستہ دیگر معاشرتی و مذہبی اقدار بھی ٹیکنالوجی کے حامل معاشروں میں زوال کا شکار ہوگئیں، جرائم، خودکشی کے حوالے سے پہلے مغربی ممالک آگے آگے تھے اب اعداد وشمار بتا رہے ہیں کہ چین خودکشی کی شرح میں سب سے آگے جا رہا ہے، کیونکہ سائنس وٹیکنالوجی میں چین کی ترقی کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے، لیکن خودکشی میں اضافے کا براہ راست تعلق ٹیکنالوجی میں ترقی سے ہے، آج دنیا میں جرائم، خودکشی اور خاندان کے زوال کا سب سے زیادہ شکار وہی ممالک ہیں جو ٹیکنالوجی کی دوڑ میں سب سے آگے ہیں، ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں انسانی صحت اور ماحول کو پہنچنے والا ناقابل تلافی نقصان اس معاملے کا دردناک پہلو ہے، جو ٹیکنالوجی کی حامل قوموں کی سنگ دلی اور دریدہ ذہنی کا شاہکار ہے، ۲۰۰۹ء کوپن ہیگن میں ہونے والی عالمی ماحولیاتی کانفرنس میں ٹیکنالوجیکل ممالک نے اپنے ٹیکنالوجیکل ترقی کی رفتار سست اور کم کرنے سے انکار پر اس کانفرنس کی صدارت کرنے والی خاتون نے اس کانفرنس کی قرارداد کا مسودہ پھاڑ دیا اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ ان ممالک نے صنعتی ترقی کو انسانیت کے مستقبل پر ترجیح دے دی ہے، لہٰذا اس دنیا کا اللہ ہی حافظ ہو، یہ حیرت انگیز بات اس خاتون سے قبل جرمنی کے مشہور مفکر ہائیڈیگر نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ٹیکنالوجی کے عفریت اور اس کے پیدا کردہ مسائل سے دنیا کو کون بچائے گا؟ تو ہائیڈیگر کا جواب تھا کہ ٹیکنالوجی کے عفریت سے دنیا کو صرف اللہ ہی بچا سکتا ہے حالانکہ وہ خود خدا کو نہیں مانتا تھا۔

مغرب سے ٹیکنالوجی کا حصول ناممکن

ٹیکنالوجی کے ذریعے مغرب کو شکست دینے کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ مغرب تیسری دنیا کو جدید ٹیکنالوجی ٹرانسفر نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ متروک شدہ ٹیکنالوجی دیتا ہے، ایسی ٹیکنالوجی کو ہمارے ہاں اعلیٰ اور جدید تحقیق کے نچوڑ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ایسی صورت حال میں جب کہ امت نے مغرب سے مقابلے کی ٹھان لی ہو تو کیا مغرب

خود جدید ترین ٹیکنالوجی طشتری میں رکھ کر پیش کرے گا کہ یہ لو مجھے اسی ٹیکنالوجی سے ختم کردو، ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں،اس مسئلے کا دوسرا حل سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں تحقیق ہے مگر مغربی مما لک کو اس میدان پیچھے چھوڑ نا ناممکن ہے کیونکہ مغربی مما لک کو ملٹی نیشنل کمپنیاں اربوں روپے کی سرمایہ کاری اس مد میں کر رہی ہیں،سائنسی تحقیق کے جس میدان میں ہم ابتدائی پیش رفت کر رہے ہیں مغربی مما لک اس میں کئی دہائیاں بلکہ نصف صدی آگے ہیں،ہم محض سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں،اگر ہمارے پاس کچھ نہ کچھ ٹیکنالوجی آ بھی جائے تو ہم اس کے تحفظ کے لیے فکر مند رہتے ہے۔

ٹیکنالوجیکل انسان کی بے حسی

ٹیکنالوجی کی بحث میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی جن مسائل کا سبب ہے ان میں ایک بے حسی بھی ہے جو براہِ راست ٹیکنالوجی کے استعمال سے وابستہ ہے،اس کی مثال یہ ہے کہ ماضی میں انسان جنگوں میں تلوار اور تیر وتفنگ کے ذریعے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھا،ان جنگوں میں تلوار استعمال کرنے والا اپنی بہیمیت کے نتائج کا خود مشاہدہ بھی کرتا تھا اور ان سے متاثر بھی ہوتا تھا،ان قدیم جنگوں میں جب تاتاریوں جیسے سفاک حملہ آوروں کی تلواریں بغداد کے ان بے بس مسلمان بچوں،عورتوں اور بزرگوں پر پڑیں،جنہوں نے اپنے آخری وقت میں کلمہ طیبہ کو یاد رکھا تو تاتاریوں کو کلمہ طیبہ کے پیغام کی طاقت اور اور خود اپنی طاقت کی کمزوری کا احساس ہوا،اسی احساس نے تاتاریوں کے کیمپ میں ایمان کی شمع روشن کی،ورنہ بغداد کی عسکری وعلمی طاقت تو ہزیمت سے دوچار ہو چکی تھی،اگر تاتاری اسلام کے ابدی پیغام سے متاثر نہ ہو جاتے تو اس وقت دنیا کی کون سی طاقت تھی جو انہیں دشمن اسلام سے مجاہد اسلام میں تبدیل کر سکتی۔

روایتی اور جدید ٹیکنالوجی میں فرق

ٹیکنالوجی کا استعمال انسانوں کو اپنے عمل کے نتائج اور مضمرات سے غیر متعلق کر دیتا ہے،ایٹمی ٹیکنالوجی استعمال کر کے امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں بڑے پیمانے پر تباہی مچادی اور لاکھوں انسانوں کو ہلاک کرنے کے علاوہ بے شمار افراد کو اپاہج بنا دیا،مگر امریکہ کی حکومت اور وہاں کے عوام اس انسانی المیہ سے غیر متعلق رہے کیوں کہ ٹیکنالوجی کے استعمال کے نتیجے میں کسی زخمی اور متوفی جاپانی کے خون کے چھینٹے ان کے ہاتھوں پر نہیں پڑے اور نہ اس المیے کا انہوں نے اس جنگ میں مشاہدہ کیا،ایک امریکی ہوائی جہاز نے جا کر یہ تباہی کر دی اور بس،مگر آج تک ہیروشیما اور ناگاساکی کے اپاہج پیدا ہونے والی جاپانی نسل اس حملے کے نتائج بھگت رہی ہے،روایتی اور جدید ٹیکنالوجی میں فرق یہ ہے کہ تلوار سے ہونے والی جنگ انسان کو زندگی اور اس کے حقائق سے جوڑ کر رکھتی تھی اور اس کے برعکس جدید ٹیکنالوجی زندگی کے تلخ حقائق سے انسان کو کاٹ دیتی ہے،فرض کریں کہ پینٹاگون میں بیٹھے ہوئے امریکی افسروں کو

معلوم ہو کہ کسی ادارے میں بیٹھ کر کچھ لکھاری امریکہ کے خلاف لکھ اور بول رہے ہیں جس کے نتیجے میں امریکی دفاعی مفادات کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے تو وہ امریکی آفیسر ایک ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر بڑے اطمینان سے امریکی بحری بیڑے کو اسی عمارت پر میزائل داغنے کا حکم دے کر مزے سے آئس کریم کھاتے ہوئے میزائل حملے کے نتائج دیکھ سکتا ہے، اس کے مقابلے میں قدیم طریقے سے دوبدو لڑنے والا فوجی، ہوسکتا ہے کہ بے گناہ بچوں اور بزرگوں کی خون میں لت پت لاشوں کے منظر کی تاب نہ لا سکے اور ہوسکتا ہے اپنے ہتھیار سے خود اپنے آپ کو ہی قتل کر دے یا اپنے عقیدے پر موت تک استقامت کا مظاہرہ کرنے والے اہل ایمان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، آج عالمی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والے زبردست پراپیگنڈے اور مہم کے باوجود اسلام انتہائی تیزی سے انہی ممالک میں پھیل رہا ہے جو سائنس و ٹیکنالوجی کی دوڑ میں سب سے آگے ہیں، مغربی یورپ میں قبولیت اسلام کی بلند شرح اسلام کے ابدی پیغام کی قوت کی مظہر ہے ورنہ وہاں تو تمام تر ٹیکنالوجی اور میڈیا اسلام مخالف یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔

جدید اور قدیم سائنس کے مقاصد

یہ امر تو واضح ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی تو عاد و ثمود اور اہرام مصر سے لے کر آج تک ہر زمانے میں موجود رہی ہے مگر اس سلسلے میں یہ سوال بھی اہمیت کا حامل ہے کہ کیا قدیم و جدید ٹیکنالوجی کا مقصد اور طریقے کار یکساں ہیں؟ اس سوال کے جواب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم دور میں سائنس کا مقصد تلاش حقیقت تھا اور ٹیکنالوجی کا مقصد انسانی ضروریات کی تکمیل رہا ہے مگر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا واحد مقصد سرمائے کا زیادہ سے زیادہ ارتکاز ہے، ایسی ہر ایک ایجاد جو سرمائے میں اضافے کا باعث نہ بن سکے فروغ نہیں پا سکتی۔

لہٰذا ماڈرن مفکرین کا یہ کہنا کہ ہم آج جو زوال پذیر ہیں وہ اس لیے کہ ہم نے مغرب کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے، اور ہم نے سائنس و ٹیکنالوجی کو چھوڑ دیا حالانکہ سائنس و ٹیکنالوجی کے بغیر کوئی قوم جی نہیں سکتی۔ اس سلسلے میں چند سوالات پیش خدمت ہے جو ہمیں سوچ و فکر کی دعوت دیتا ہے خصوصاً سائنس و ٹیکنالوجی کے دلدادہ گان کو اس میں عبرت کا سامان بھی موجود ہیں، عرض یہ ہے کہ کیا ٹیکنالوجی واقعی اتنا اہم ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال اور انسانی مسائل حل کرنے میں مفید ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو...............

☆ آخر کار موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو باوجود اس کے کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی رکھتا تھا، کیوں کر شکست دی؟

☆ آخر کار مسلمانوں کے دورِ عروج (عہد رسالت اور عہد خلافت کے زریں ادوار) میں سائنس کی ترقی کے لیے کیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا؟

☆ آخر کار خیر القرون کا دور سائنس کی عظیم ترقی سے کیوں خالی رہا؟

☆ آخر کار کبار صحابہ کرام میں کتنے سائنسدان تھے؟ اگر نہیں تو سائنس کے بغیر ہی انہوں نے تین براعظموں کو کیسے فتح کیا؟

☆ آخر کار وہ کونسی ٹیکنالوجی تھی جس سے مسلمانوں نے میدان بدر میں اپنے سے تین گنا زیادہ بڑی طاقت (جو اسلحہ سے مکمل لیس اور مادی لحاظ سے طاقت ور تھی) کو شکست دی؟

☆ آخر کیا وجہ تھی کہ قرون اولیٰ کے مسلمان بغیر کسی سائنس و ٹیکنالوجی کے اپنے وقت کی سپر پاورز قیصر و کسریٰ سے ٹکرائے اور ان کو پاش پاش کر دیا؟

☆ وہ کون سی طاقت تھی کہ مدینہ کے منبر پر امیر المؤمنین جمعہ کے خطبے کے دوران فرماتے یـــا ساری الجبل (اے ساریہ! پہاڑ کی طرف سے ہوشیار) اور حضرت ساریہ میلوں دور اس آواز کو سنتے اور حکمت عملی ترتیب دیتے اور بالآخر کامیاب ہوتے یہ کون سی طاقت تھی جس نے کامیاب کرایا؟

☆ آخر سائنس و ٹیکنالوجی میں اپنے وقت کے امام ہونے کے باوجود اندلس کے مسلمان کیوں زوال پذیر ہوئے؟ اور عظیم سائنسی ایجادات کے باوجود اپنا تحفظ کیوں نہ کر سکے کہ وہاں کوئی مسلمان باقی نہ بچا؟

☆ آخر سائنس و ٹیکنالوجی میں اپنے وقت کا امام ہونے کے باوجود خلافت عباسیہ جاہل اجڈ تاتاریوں سے کیوں شکست کھا گئی؟

☆ آخر وہ کون سی ٹیکنالوجی اور فلسفہ تھا کہ پچاس سال کے اندر اندر مسلمان بغیر کسی مادی وسائل کے دوبارہ غالب آ گئے، چنگیز خان کے پوتے برقہ خان نے اسلام قبول کیا اور طاقت کا توازن بدل گیا؟

☆ آخر ترک ویانا میں داخل کیوں نہ ہو سکے؟ جب کہ ترکوں کے پاس ٹیکنالوجی اور مادی وسائل یورپ سے کہیں زیادہ تھے؟

☆ آخر مغلیہ سلطنت چند ہزار انگریزوں سے کیسے شکست کھا گئی؟ جب کہ مغلیہ سلطنت کی طاقت، ٹیکنالوجی انگریزوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی؟

☆ آخر سائنس و ٹیکنالوجی میں اپنے وقت کا سرخ درندہ (روس) افغانستان میں کیوں ناکام ہوا؟

☆ آخر ترکی ،مصر، ملائیشیا نے مغربی فکر اور تعلیم کو اپنایا تو وہاں کیا ترقی ہوئی ؟انہیں کیا عروج نصیب ہوگیا؟

☆ آخر سر سید احمد خان نے جو علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی تھی کیا آج یورپ اس سے علم کشید کر رہا ہے؟ کیا اس یونیورسٹی کے ذریعے مسلمان کامیاب ہوگئے؟ کیا برصغیر کے مسلمانوں نے عروج حاصل کرلیا؟

معذرت کے ساتھ ہمارے مفکرین گذشتہ دوسو سال سے صرف مغرب سے احساسِ کمتری کا شکار ہوکر ہمیں مغرب کی نقالی کا درس دیتے رہتے ہیں، حالانکہ مغرب کی نقالی نے تو ہمیں تباہ کر دیا ہے،اور مغرب کی اس ٹیکنالوجی نے ان سے ان کا خاندان چھین لیا، ان سے ان کا سکون چھین لیا، ان کی محبتیں اس ٹیکنالوجی کی بھینٹ چڑھ گئیں اور یہاں تک کہ ان سے ان کا مذہب بھی چھین لیا تو یہ مفکرین ٹیکنالوجی سے ہمیں کیا دینا چاہتے ہیں؟ مسلمانوں کی ترقی کا راز مادی ترقی نہیں،صرف اور صرف ایمانی قوت میں مضمر ہے۔

مولانا مقصود علی
مدرس معہد ہذا

ماہ محرم اور عاشوراء کی فضیلت

اللہ تعالیٰ وتبارک تعالیٰ نے جب سے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا تو اس وقت سے سال کے بارہ مہینوں کا انتخاب فرمایا اور ان بارہ مہینوں میں چار مہینوں (ذی القعدة ،ذی الحجة ،محرم، رجب) کو خصوصی امتیاز سے نوازا، محرم الحرام مذکورہ چار مہینوں میں ایک اور اسلامی سال کا آغاز کرنے والا مہینہ ہے، ماہ محرم بہت ہی فضائل و برکات کا حامل مہینہ ہے، یہ مہینہ اپنی امتیازی شان اور نمایاں خصوصیات کی وجہ سے دیگر مہینوں سے علیحدہ شناخت رکھتا ہے، جس میں تاریخ کے بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے اور یہ مہینہ اسلامی تاریخ کے یادگاروں سمیت گزرے ہوئے امتوں اور سابقہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی کارہائے نمایاں انجام اور خالق لم یزل کی فضل وکرم کی یادیں بھی اپنے دامن میں سمیٹی ہوئی ہے، محرم کے مہینہ کو محرم اس کی تعظیم کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

ماہ محرم کی فضیلت احادیث کی روشنی میں

عن ابی هريرة رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم افضل الصيام بعد رمضان شهرالله المحرم وافضل الصلوة بعد الفريضة صلوة الليل (مسلم: ح،۱۱۶۳) رمضان کے بعد سب سے افضل روزے ماہ محرم کے روزے ہیں اور فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔

عن ابن عباس رضى الله عنه قال مارأيت النبى صلى الله عليه وسلم يتحرى صيام يوم فضله على غيره الاهذا اليوم يوم عاشوراء وهذا الشهر يعنى شهر رمضان (بخاری: ح،۲۰۰۶) حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی فضیلت والے دن کے روزے کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے ہوں اور بہت زیادہ فکر کرتے ہوں سوائے اس دن یوم عاشوراء کے، سوائے اس ماہ مبارک رمضان کی۔

تقویم اسلامی کے سب سے پہلے مہینے محرم الحرام کا دسواں دن اور بعض روایات میں نواں دن یوم عاشورہ کہلاتا ہے، یوم عاشوراء محرم کی دسویں تاریخ کے سلسلے میں مورخین لکھتے ہیں کہ اس دن بڑے بڑے واقعات رونما

ہوئے، اسی دن بنی اسرائیل کو ان کے دشمن فرعون سے نجات دلائی گئی، اسی دن فرعون کو غرق کیا گیا، مسند احمد کی روایت کے مطابق اسی یوم عاشوراء کو نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر لنگر انداز ہوئی اور اسی روز حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا، حضرت ابوموسی اشعری سے روایت ہے کہ یہودی یوم عاشوراء کی بہت تعظیم کرتے تھے اور اس دن عید مناتے تھے، خیبر کے یہودیوں کی عورتیں اس دن عمدہ لباس اور زیور پہنتی تھیں، عاشوراء کا یہ لفظ الف ممدودہ کے ساتھ ہے عاشورہ پڑھنا اور لکھنا جو مروج ہے، درست نہیں ہے (حاشیہ صاوی علی الشرح الھندیہ)

یوم عاشوراء کی فضیلت

یوم عاشوراء کی فضیلت اور اس کے روزے کی اہمیت کے بارے میں متعدد روایات آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اور آپ کے صحابہ سے منقول ہیں چند روایات کتبِ احادیث سے پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رمضان المبارک کے بعد سب سے زیادہ افضل روزہ محرم کا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ یوم عاشوراء کا روزہ رکھو کیوں کہ اس دن کا روزہ انبیاء کرام رکھا کرتے تھے، ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا اگر ماہ رمضان کے علاوہ روزہ رکھنا چاہو تو پھر محرم کا روزہ رکھا کرو، کیوں کہ یہ اللہ تعالی کا مہینہ ہے، اس مہینہ میں ایک دن ایسا ہے، جس میں اللہ تعالی نے پچھلے لوگوں کی توبہ قبول فرمائی اور اسی دن آئندہ بھی لوگوں کی توبہ قبول فرمائیں گے، یوم عاشوراء کے موقع پر لوگوں کو سچی توبہ کی تجدید پر ابھارا کرو اور توبہ کی قبولیت کی امید دلاؤ کیوں کہ اللہ تعالی اس دن پہلے لوگوں کی توبہ قبول کر چکے ہیں اسی طرح آنے والوں کی بھی توبہ قبول فرمائیں گے۔

یوم عاشوراء زمانہ جاہلیت میں

یوم عاشوراء زمانہ جاہلیت میں قریش مکہ کے نزدیک بھی بڑا محترم دن تھا، اسی دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا اور قریش اسی دن روزہ رکھتے تھے، قیاس یہ ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی کچھ روایات اس دن کے بارے میں ان تک پہنچی ہوں گی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ قریش ملتِ ابراہیمی کی نسبت جو اچھے کام کرتے تھے، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اتفاق اور اشتراک فرماتے تھے، پس اپنے اس اصول کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ساتھ عاشوراء کا روزہ بھی رکھتے تھے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، قریش زمانہ جاہلیت میں یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قبل البعثت کے زمانے میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور یہاں کے یہود کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کا

روزہ رکھتے دیکھا اوران سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہود کے یہاں یہ دن انتہائی مبارک ومسعود ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن روزے کا اہتمام فرمایا اور مسلمانوں کو عمومی حکم دیا کہ وہ بھی اس دن روزہ رکھیں۔

یوم عاشوراء کی تعین میں اہل علم کی تحقیق

یوم عاشوراء کی تعیین کے سلسلے میں روایات میں اختلافات پایا جاتا ہے بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عاشوراء محرم کی دسویں تاریخ کو کہتے ہیں، اکثر اہل علم اسی کے قائل ہیں، لیکن بعض کے نزدیک اس سے مراد محرم الحرام کی نویں تاریخ ہے، پہلی صورت میں یوم کی اضافت گزشتہ رات کی طرف ہوگی اور دوسری صورت میں یوم کی اضافت آئندہ رات کی طرف ہوگی، غالبًا اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم دیتے وقت فرمایا کہ یہود چونکہ دسویں محرم کو عید مناتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں اس لئے تم اس کے ساتھ نویں یا گیارہویں محرم کو روزہ رکھو اور فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو یہود کی مخالفت کرتے ہوئے نویں محرم کو روزہ رکھوں گا۔

اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، الحکم بن الاعرج کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا جبکہ وہ زمزم کے پاس اپنی چادر کا تکیہ بنائے ہوئے تھے، میں نے پوچھا کہ مجھے یوم عاشوراء کے بارے میں بتائیے کیوں کہ میں اس کا روزہ رکھنا چاہتا ہوں، ابن عباسؓ کہنے لگے کہ جب محرم الحرام کا چاند نظر آئے تو دن گننا شروع کردو اور پھر نو تاریخ کی صبح کو روزہ رکھو، تو میں نے پوچھا کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی دن روزہ رکھتے تھے؟ تو ابن عباس نے جواب دیا! ہاں (مسلم: ح ۱۱۳۴) ابن عباسؓ کی روایت کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے کہ میں آئندہ سال زندہ رہا تو یہود کی مخالفت کرتے ہوئے نویں محرم کو عاشورہ کا روزہ رکھوں گا۔

اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ اصل افضلیت والا دن دس محرم ہے کیونکہ اسی دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ روزہ رکھتے تھے تاہم اللہ کے رسول کا یہ فرمان کے آئندہ سال میں نو کا روزہ رکھوں گا اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ میں دس کا روزہ چھوڑ دوں گا بلکہ آپ کی مراد یہ تھی کہ دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھوں گا تاکہ یہود ونصاریٰ کی بھی مخالفت ہوسکے چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانی اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں نویں کو روزہ رکھنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ فرمایا اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں اور علماء نے دونوں بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ آئندہ سے ہم بجائے دسویں کے یہ روزہ نویں محرم ہی کو رکھیں گے اور دوسرا یہ کہ آئندہ سے ہم دسویں محرم کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھا کریں گے اور اس طرح سے ہمارے اور یہود ونصاری کے طرز عمل میں فرق ہوجائے گا، اکثر علماء نے اسی دوسرے مطلب کو ترجیح دی ہے اور یہ کہا ہے کہ یوم عاشوراء کے ساتھ اس سے پہلے نویں کا روزہ بھی رکھا جائے اور

اگر نویں کو کسی وجہ سے نہ رکھا جا سکے تو اس کے بعد کے دن گیارہویں کو رکھ لیا جائے، (معارف الحدیث ج ۴ ص ۱۷۱)
اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے، انہوں نے ایک موقع پر کہا صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیھود کہ تم لوگ یہودیوں کی مخالفت کرتے رہو، نویں اور دسویں محرم دونوں دن روزہ رکھو۔

عاشوراء کے روزہ کا حکم

بعض احادیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عاشوراء کے روزے کا ایسا تاکیدی حکم دیا جیسا حکم فرائض اور واجبات کے لئے دیا جاتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ عاشوراء کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کی بستیوں میں یہ اعلان کرا دیا کہ لوگوں میں جس نے روزہ رکھا ہے، اسے پورا کرے اور جس نے نہیں رکھا وہ اسی حال میں دن گزارے اور کچھ نہ کھائیں پئیں بلکہ روزہ داروں کی طرح رہیں، اس کے بعد انصار مدینہ کا یہ معمول تھا کہ وہ یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے، ان کے بچے بھی روزہ رکھتے تھے، بچوں کو مسجد میں لے جاتے انہیں کھلونے دیتے لیکن جب کوئی بچہ بھوک سے روتا تو اسے کھانا بھی کھلا دیا جاتا تھا، ان احادیث کی بناء پر، بہت سے ائمہ نے یہ سمجھا ہے کہ شروع میں عاشوراء کا روزہ واجب تھا، بعد میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کے روزے کی فرضیت منسوخ ہوگئی اور اس کی حیثیت ایک نفلی روزے کی رہ گئی، جس کے بارے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے کہ مجھے اللہ تعالی سے امید ہے کہ اس کی برکت سے پہلے ایک سال کے گناہوں کی صفائی ہو جائے گی۔

اور صوم عاشوراء کی فرضیت منسوخ ہو جانے کے بعد بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی رہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے فرض روزوں کے علاوہ سب سے زیادہ اہتمام نفلی روزوں میں اسی کا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء میں روزے رکھنے کو اپنا اصول و معمول بنالیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا تو بعض صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس دن کو تو یہود و نصاری بڑے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں (اور یہ گویا ان کا قومی، ملی اور مذہبی شعار ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انشاء اللہ جب اگلا سال آئے گا تو ہم نویں کو روزہ رکھیں گے، عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں لیکن اگلے سال کا محرم آنے سے پہلے ہی رسولؐ کی وفات ہوگئی۔

عاشوراء کا روزہ ایک ہے یا دو؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

مسنون روزہ یوم عاشوراء (دس محرم) اور اس کے ساتھ نویں یا گیارہویں تاریخ کا روزہ ہے، حضرت ابوقتادہؓ

سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس دن کا روزہ گزرے ہوئے سال کے گناہوں کے لئے کفارہ ہوجائے گا، چوں کہ یہودی بھی اس دن روزہ رکھا کرتے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امتیاز کے طور پر دس کے ساتھ نو محرم کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے خود آپ کا بھی یہی معمول نقل کیا ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء یہی روزہ فرض تھا اور ماقبل اسلام ہی سے قریش یہ روزہ رکھا کرتے تھے، بعد کو جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو اس روزہ کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تنہا دس تاریخ کو روزہ رکھنا مکروہ ہے، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ رحمہم اللہ کے یہاں مکروہ نہیں، خیال ہوتا ہے کہ چوں کہ فی زمانہ یہودیوں کے یہاں قمری کیلینڈر مروج ہے اور نہ اس دن روزہ رکھنے کا اہتمام ہے، اس لئے نو تاریخ کو روزہ رکھنے کی اصل علت یعنی یہود سے تشبہ اور مماثلت موجود نہیں، لہذا تنہا دس محرم کو روزہ رکھنا بھی کافی ہے (قاموس الفقہ لفظ صوم)

اور مولانا منظور نعمانیؒ معارف الحدیث میں فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں چونکہ یہود و نصاری وغیرہ یوم عاشوراء (دسویں محرم) کو روزہ نہیں رکھتے، بلکہ ان کا کوئی عمل بھی قمری مہینوں کے حساب سے نہیں ہوتا اس لئے اب کسی اشتراک اور تشابہ کا سوال ہی نہیں رہا لہٰذا فی زمانہ رفع تشابہ کے لئے نویں یا گیارہویں کا روزہ رکھنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے (معارف الحدیث ج۴ ص۱۷۱)

اہل عیال پر فراخی کی روایت

ایک روایت عوام میں معروف ہے کہ من وسع علی عیاله یوم عاشوراء وسع اللّٰه علیه سائر سنته جو عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال پر وسعت برتے اللہ تعالی اس پر پورے سال وسعت میں رکھیں گے۔

اس بناء پر حصکفی، شامی اور صاوی وغیرہ نے اس دن بال بچوں پر خرچ کرنے میں فراخی کو مستحب قرار دیا ہے، حصکفی نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر حدیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے، بلکہ خود سیوطی نے بھی اس پر صحیح کا رمز لگایا ہے، لیکن محققین علماء کے نزدیک یہ ادعاء درست نہیں ہے، اس روایت کو طبرانی نے حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے، پہلی حدیث میں محمد بن اسماعیل جعفری اور دوسری حدیث میں ہیصم بن شداخ ہیں، بیہقی نے ان دونوں ہی راویوں کا حد درجہ ضعیف ہونا نقل کیا ہے، ابن رجب نے اس کو ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جتنی سندوں سے مروی ہے سبھی ضعیف ہیں، ابن عدی نے اس کو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، لیکن بقول زین الدین عراقی اس میں تین تین ضعیف راوی موجود ہیں، حجاج بن نصیر، محمد بن ذکوان، سلیمان بن ابی عبداللہ بلکہ ابن جوزی نے تو

اس کوموضوع اور مجد الدین فیروز آبادی نے قاتلان حسین کی من گھڑت بات قرار دیا ہے، مذکورہ روایت کے متعلق محقق العصر شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی رقمطراز ہیں یہ حدیث اگر چہ سند کے اعتبار سے مضبوط نہیں لیکن اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس عمل پر جو فضیلت بیان کی گئی ہے وہ انشاء اللہ حاصل ہوگی لہٰذا اس دن گھر والوں پر کھانے کی وسعت کرنی چاہیے (محرم الحرام اور عاشوراء کی حقیقت)

حاصل کلام

الغرض عاشوراء کی اہمیت وفضیلت اس بات کا متقاضی ہے کہ اس دن روزہ رکھا جائے اور پورے دن کو ذکر خداوندی اور یاد الٰہی میں گزارا جائے، روزہ رکھنے سے فائدہ ملے گا کہ اس دن زیادہ نیکی اور ثواب کمانے کا موقع ملے گا، اور ساتھ ہی اس اہم دن کو سنجیدگی کے ساتھ گزارنے کا موقع ملے گا۔ یوم عاشوراء کے متبرک موقع پر یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ اس عظیم دن کو لا پرواہی میں گزار دیا جائے، یا اس دن غیر مناسب کام کئے جائیں، اللہ تعالی ہم تمام مسلمانوں کو اس دن کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے فضل وکرم سے اس مہینہ کی حرمت اور یوم عاشوراء کی حرمت اور عظمت سے فائدہ اٹھانے اور تمام رسومات اور بدعات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے آمین، ویرحم اللہ عبداقال آمینا

مفتی فضل وہاب بنوری

مدرس معہد ہذا

خرید وفروخت اور اسلام کا منصفانہ نظام

اسلامی نقطہ نظر سے کائنات انسانی کے عملی زندگی کی دو محور ہیں اول حقوق اللہ کہ جسے عبادات کہتے ہیں اور دوم حقوق العباد کہ جسے معاملات کہا جاتا ہے یہی دو اصطلاحیں ہیں جو انسانی نظام حیات کے تمام اصول وقواعد اور قوانین کی بنیاد ہیں۔ مذکورہ دونوں پہلوں میں سے ہر ایک مستقل موضوع ہے جس کے احکام شرعی جاننا، سمجھنا اور سمجھانا ہر مؤمن مسلمان کے ذمہ فرض کا درجہ رکھتا ہے جسے ہمارے اسلاف ،فقہاء کرام اور علماء کرام نے بڑی مشقتوں کے ساتھ نبھایا ہے چنانچہ زیر نظر تحریر بھی اس کاوش کی ایک کڑی ہے۔

خرید وفروخت کی مشروعیت

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:

و احل اللّٰه البیع و حرم الربوا(البقرہ: ۲۷۵)

اللہ تعالی نے خرید وفروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

تجارت اور اسکی فضیلت

تجارت ایک باعزت اور باوقار پیشہ ہے، اس پیشہ کی فضیلت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود نبوت سے قبل بارہ سال تک تجارت کرتے رہے، بعض جلیل القدر صحابہ کا بھی یہی شغل رہا اور صحابہ کرام کے بعد مسلمانوں نے اس میدان میں خوب ترقی بھی کی ، اور اس میں نیک نامی بھی پیدا کی، تجارت کا پیشہ اگر اسلامی حدود کے اندر رہ کر اختیار کیا جائے تو دنیا میں فراوانی رزق کے علاوہ اخروی زندگی میں بھی بلندء درجارت پر فائز کر دیتا ہے، ابوسعید خدری کی روایت ملاحظہ ہو۔

"عن ابی سعِید، عن النبِیِ صلی الله علیهِ وسلم، قال: التاجِر الصدوق الامِین مع النبِیین، والصِدِیقِین، والشهداء(الترمذی: ح ۱۲۰۹)

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچ گو اور امانت دار

تاجر (قیامت کے دن) نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

معاملات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جانبین میں کسی ایک کی طرف سے دوسرے کو نقصان وضرر نہ ہو، اسی طرح معاملہ میں دھوکہ وغرر نہ ہو، سنن ابن ماجہ میں ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنه قال: قال رسول اللہ صلی الله علیه وسلم: لا ضرر ولا ضرار (ابن ماجه: ح ٢٣٤١)

: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہ نقصان اٹھانا جائز ہے اور نہ نقصان پہنچانا درست ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر گیہوں کے ایک ڈھیر کے قریب سے گزر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں نے نمی محسوس کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اناج (گیہوں) کے مالک ! یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس پر بارش برس گئی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پھر تو نے اس (نمی زدہ حصے) کو گیہوں کے ڈھیر کے اوپر کیوں نہ ڈال دیا تا کہ (خریدار) لوگ اسے دیکھ لیتے، جس نے دھوکہ دیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں (المسلم: ح١٠٢)

اسلامی نظام معاش میں جہاں خرید وفروخت کی مشروعیت ہوئی ہے وہاں اسکے اصول وضوابط بھی بتلائے گئے ہیں، کسی چیز کی تجارت، خرید وفروخت جب اسلامی اصول وقواعد کے مطابق ہو تو جائز ہے اور جب اسلام کو معیار ٹھہرائے بغیر دنیا کی حرص ولالچ کے تحت تجارت کیا جائے تو وہ غیر اسلامی اور ناجائز ہوگی۔

آج کل ایسی تجارتوں سے بھی بازار گرم ہیں جس سے شریعت مطہرہ نے منع فرمایا ہے اور کسی چیز کا منع ہونا اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے اور حرام چیز کی تجارت کرنا اللہ تعالی سے اعلان بغاوت ہے۔

چند صورتیں ملاحظہ ہوں!

☆ ایک مسلمان کی سودے پر سودا کرنا, جبکہ ہم حرص میں دوسرے مسلمان سے زیادہ پیسے دینے کو تیار ہو جاتے ہیں اور وہی سودا اپنے نام ہی کر لیتے ہے۔

☆ گاہک کو دھوکہ دینے کے لئے بڑھ چڑھ کر بولی کرنا

☆ حرام اور ناپاک چیزوں کی تجارت، مثلا شراب، تصویریں اور فحش ویڈیوز وغیرہ

☆ دھوکہ کی تجارت

☆ غیر موجود چیز کی تجارت

☆ قرض کے ساتھ قرض کی تجارت

☆ دودھ روکے ہوئے جانور کی تجارت

☆ تجارتی قافلوں کو منڈی میں آنے سے پہلے ہی جا ملنا اور ان کو منڈی کے اصل ریٹ سے دھوکے میں رکھتے ہوئے ان سے سامان خریدنا

☆ پھلوں اور اناج پکنے سے پہلے ہی کھیت میں فروخت کر دینا۔

مندرجہ بالا مفاسد کو شریعت مطہرہ نے واضح طور پر ناجائز قرار دیا ہے اسکے باوجود یہی مفاسد ہمارے بازاروں میں کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور تاجر حضرات ان فضیلتوں سے محروم ہیں جو کسی امانت دار اور سچے تاجر کے ہوتے ہیں جس کا بیان اوپر ہو چکا، اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ گاہک کی ضرورت کو دیکھ کر اسے ایک چیز مہنگی دام فروخت کیا جاتا ہے مثلاً ایسا گاہک سامنے آتا ہے جس کے بارے میں تاجر کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اس سے ضرور مال خریدے گا، کبھی مارکیٹ میں کہیں مال نہ ہونے کی بناء پر، کبھی کسی اور بناء پر، ایسی صورت میں تاجر اس گاہک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مارکیٹ سے زائد پر مال فروخت کرتا ہے، شرعاً تو جتنے داموں پر بھی سودا ہو جائے جائز ہے، لیکن کسی کی مجبوری یا ناواقفیت کی وجہ سے زیادہ وصول کرنا کاروباری بددیانتی ہے۔

خرید وفروخت میں منافع کی حد

فتاوی عثمانی میں علامہ تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالی نے لکھا ہے کہ خرید وفروخت میں نفع کی شرعا کوئی حد متعین نہیں، البتہ دھوکا نہیں ہونا چاہئے (فتاوی عثمانی، ج ۳، ص ۲۵۳)

شریعت مطہرہ صریح ظلم کی اجازت نہیں دیتی (جسے عرفِ عام میں جیب کاٹنا کہا جاتا ہے) جو شخص ایسی منافع خوری کا عادی ہو اس کی کمائی سے برکت اٹھ جاتی ہے، اور حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ منصفانہ منافع کا ایک معیار مقرر کر کے زائد منافع خوری پر پابندی عائد کر دے۔

اسلام کے منصفانہ نظام کا آپ کو اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ نقد کسی چیز کے فروخت کرنے پر آپ دس روپے منافع کرتے ہیں تو ادھار میں آپ کو پندرہ روپے منافع کیساتھ فروخت کرنے کی اجازت ہے (شرح المجلۃ: مادہ ۲۴۵)

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمارے سارے معاملات درست کریں اور ہمارے سارے بازاروں کی تجارتیں اسلام کے اصول وضوابط کے مطابق ہوں اور اسلام کا بول بالا ہوں۔ آمین

مولانا عبدالرؤف بادشاہ
مدیر مسؤل

شیخ الحدیث حضرت مولانا شیر اسلم خان صاحبؒ کا سانحہ ارتحال

علماء کا اٹھ جانا علامات قیامت میں سے ہے، علماء کے اٹھنے کے ساتھ علم بھی اٹھتا چلا جاتا ہے اور آج ہم اسی مصیبت سے دوچار ہیں کہ علماء راسخین کی پہلے ہی سے بہت کمی ہے اور اس قحط الرجال کے دور میں جو چند اہل علم ہیں وہ بھی ہمیں داغِ مفارقت دیے چلے جارہے ہیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے اٹھے چلے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی!

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کسی کے لیے ممکن نہیں، ہر ذی روح کو اس منزل سے گزرنا ہے، مگر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کی موت کا غم لوگ مدتوں فراموش نہیں کر سکتے اور جن کا غم عام اور محیط ہوتا ہے، ان وفیات حسرت میں علم حدیث کے کوہ ہمالیہ اور درس نظامی کے ماہر شیخ الحدیث مولانا شیر اسلم خان قدس سرہ کا سانحہ ارتحال بھی ہے جو گذشتہ مہینے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دار فانی کو سدھار گئے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں دین حنیف کے لیے وقف کر رکھی تھیں، مولانا شیر اسلم خانؒ کی وفات حسرت کی خبر نے سچ مچ ان دلوں کو دہلا دیا ہے، جس میں علم حدیث کی عظمت کے ساتھ اس کی درایت کے صفات ہوتے ہیں، علم حدیث پر گہری نظر، اس کی تدریس ومطالعہ کا وسیع تجربہ، اس کے اختصاصات پر کامل واقفیت اور حدیث سے گہری مناسبت رکھنے والے عالم دین حضرت مولانا شیر اسلم خانؒ کے انتقال سے علمی حلقوں میں ایک سُن کر دینے والی خاموشی پائی جارہی ہے، میدان حدیث میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے چہروں کی لکیریں غم وحزن سے سرخ ہو چکی ہیں، خصوصاً طالبین علم حدیث ایک ایسے آبشار سے محروم ہو چکے ہیں، جس کے ہر قطرہ میں علم حدیث کی بو، پاکیزگی

اورنفاست جھلکتی تھی ، جس کا ہرسیل علمی لطافتوں اورفنی وفقہی تجربات کی عکاسی کرتا تھا،حضرت مرحوم کوتدریس وتعلیم کا چالیس سالہ تجربہ تھا، وہ ایسے شخص تھے جنہیں درس نظامی کی ہرکتاب پراختصاص حاصل رہا تھا،حضرت شیخ جہاں علوم ومعارف کے تاجور تھے، وہاں صلاح وتقویٰ،اخلاق وکرداراورعادات واطوار میں بدرکامل بھی تھے، درج ذیل سطور میں حضرت شیخ کامختصرسوانح حیات درج کی جاتی ہے۔

نام ونسب: آپ کا نام شیراسلم خان ولدمیراحمد ہے آپ صوابی کےمشہورگاؤں بام خیل میں ۱۹۴۷ء میں پیداہوئے۔

تحصیل علم: ایک غریب گھرانے کے ساتھ تعلق ہونے کی وجہ سے حضرت نےتحصیل علم کے دوران کافی مشقت برداشت کی ،بچپن میں انتہائی غربت کی وجہ سے اپنے والد کے ساتھ کھیتی باڑی میں مشغول رہتے تھے،لیکن محمد یحیٰ باچا عرف(سودائی باچا) کے ترغیب اورخودحضرت شیخ صاحب کی شوق ورغبت علم کی بناء پرحصول علم شروع کی خاندانی غربت کی بناء پرآپ کے والدشروع میں آپ کےحصول علم کےمخالف تھےلیکن حضرت کی ذوق وشوق کے سامنے والد کی مخالفت حصول علم میں مانع نہ رہی۔

ابتدائی تعلیم مشہور عالم دین علامہ عبدالمتین بادشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی ، پھرشاہ منصورتشریف لے گئے اورحضرات شیخین کریمین سے کسب فیض حاصل کیااس کے بعدعلم میں مزیدترقی کے لیے عالم اسلام کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک تشریف لے گئے اوروہاں پرحضرت شیخ الحدیث مولاناعبدالحق صاحبؒ ،حضرت مولانامفتی فریدصاحبؒ ،حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ (صدرصاحب)اورشیخ الحدیث ڈاکٹرشیرعلی شاہ صاحبؒ اوراس طرح عظیم محدثین سے استفادہ کرکے۱۹۷۱ءمیں دورہ حدیث سےفراغت حاصل کی۔

درس وتدریس: تحصیل علم کے بعد پاکستان کےمختلف علاقوں میں تشنگاں علوم دینیہ کوسیراب کرتے رہےجن علاقوں میں آپ نے تدریسی خدمات انجام دی ان میں مدرسہ فیض الاسلام نستہ،تعلیم العربیہ لکی مروت، جامعہ قادریہ توراڈھیر صوابی، دارالعلوم جمہوریہ تخت بھائی ،فیض الاسلام ہنگو، دارالعلوم عربیہ شیرگڑھ ، دارالعلوم عربیہ گجرات (مردان) اورمعہدالصدیق للدراسات للاسلامیۃ بام خیل صوابی قابل ذکرہے، ویسےتو آپ نےان تمام علاقوں میں اللہ تعالیٰ کے احکامات اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کوطلبہ کے سامنے خوب اجاگرکیا لیکن دارالعلوم عربیہ شیرگڑھ،اوردارالعلوم گجرات مردان میں حضرت نے اپنی تدریسی زندگی کا اکثرحصہ گزارا،آپ نے درس نظامی کے تقریباًتمام کتب کادرس دیاہےلیکن آخری تیس سال حدیث وتفسیرکادرس ایسےانہماک اورلگن سے دیتے تھے کہ طلبہ آپ کے درس میں غافل نہیں رہتے تھے درس کا انداز ایسادلنشیں اورجاذب ہوتا تھا کہ ایک ایک نکتہ پرطلبہ داددیے بغیرنہ رہ

جا سکتے تھے، زندگی کے آخری ایام میں ضعف اور بیماری کی وجہ سے اپنے علاقے بام خیل میں سکونت اختیار کی اور وہاں کے مشہور دینی درسگاہ معہد الصدیق میں دو سال تک اپنی تدریسی و علمی زندگی کا نچوڑ طلبہ کے سامنے پیش کرتے رہے آپ کے علمی خدمات سے فائدہ، صرف طلبہ تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ مدینہ مسجد (شیر اسلم خان بابا مسجد) تخت بھائی میں خطابت کی صورت میں کئی سال تک عوام الناس کی اصلاح وتربیت میں مشغول رہے۔

بیعت وخلافت: درس وتدریس کے ساتھ ساتھ احسان وسلوک سے بھی گہری وابستگی رکھتے تھے، شیخ طریقت حضرت مولانا مفتی محمد فرید رحمہ اللہ سے بیعت کر کے معمولات تصوف کی تکمیل کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے اسے خلافت سے نوازا۔

سیاسی وفلاحی خدمات: آپ کا سیاسی تعلق شروع سے آخر تک جمعیت علمائے اسلام سے رہا آپ جمعیت علمائے اسلام کے انتہائی کلیدی عہدوں پر فائز رہے، سیاسی زندگی کے دوران اسلامی حکومت کے قیام کے لیے انتہائی صعوبتیں برداشت کی لیکن ان تمام مشکلات کو اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لیے خندہ پیشانی سے جھیلتے رہے، آپ کے فلاحی خدمات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں آپ کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی دشمنیاں دوستی میں تبدیل کی، پشتون معاشرہ میں جرگے کو بہت اہمیت حاصل ہے اور آپ ہمیشہ جرگے کے اہم رکن کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان صلح وصفائی میں مشغول رہتے۔

تقویٰ اور تواضع: حضرت مرحوم گوشہ گیر، تدریس کے لیے یکسو، تنازعات سے دور اور مناقشات سے بددل تھے، وہ ہمیشہ یکسو رہے، وہ ایک دلچسپ ترین انسان تھے، تواضع، حلم وبردباری، نرم خوئی، خوش اخلاقی اور تقویٰ کے حامل تھے، انہی صفات کی بناء پر ہر خاص وعام، طلبہ، اساتذہ ملازمین اور تمام متعلقین میں محبوب شخصیت کے مالک تھے آپ پوری زندگی تقوی کے ایسے اعلیٰ درجہ پر فائز رہے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے، زندگی کی آخری ایام میں جب ضعف اور بیماری انتہائی زور پر تھی اور سبق میں کبھی کبھی ناغہ آجاتا تو ہر دفعہ مدرسہ والوں سے گزارش کرتا کہ میرے اسباق کسی دوسرے مدرس کے حوالہ کیا جائے تاکہ طلبہ کی وقت ضائع نہ ہو، حالانکہ اپنے بیماری کی وجہ سے سال کی شروع میں مدرسہ والوں سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس سال میں بغیر تنخواہ کے پڑھاؤں گا، حضرت شیخ تواضع اور کسر نفسی کی عملی مثال تھی اکثر اوقات دفتر سے نکلتے وقت سارے اساتذہ کی جوتے سیدھا کیا کرتے تھے، ان سے کبھی کوئی غلطی یا چوک ہوجاتی تو برملا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے، بلکہ بعض مرتبہ اگر اپنے شاگردوں کو ڈانٹ دیتے تو دوسرے وقت بلا تامل معذرت خواہی کرتے ہوئے نظر آتے، الغرض ان تمام خصوصیات کی حامل ایک فرشتہ انسان کے چلے جانے سے اس دنیا میں نیک بندے کم ہوتے چلے جارہے ہیں، وہ صحیح معنوں میں ایک کامل انسان، عظیم محدث اور بہترین عالم دین تھے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے منور کردے۔

آپ کے مسائل کا جواب

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیے، عدت کے دوران اسی شوہر نے اپنی بیوی مذکورہ (مطلقہ مغلظہ) سے ہم بستری کی اب وہی شخص اپنی اس کام پر سخت نادم ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا عدت کی ابتداء دوبارہ وطی سے ہوگی یا پہلے سے جو عدت جاری ہے، وہی سے ایام شمار ہو کر عورت عدت پوری کرے گی۔ سائل بندہ آف باجا

الجواب: صورت مذکورہ میں اس شخص کے لیے اپنی مطلقہ اجنبیہ عورت ہے اس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق جائز نہیں اور اس شخص نے زنا کا ارتکاب کیا ہے شرعی حکومت میں ان دونوں کی سزا رجم ہے لیکن مطلقہ مغلظہ کے ساتھ ہم بستری سے عدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اگر مطلقہ مغلظہ کے ساتھ زوج عدت میں ہم بستری کرے تو عدت دوبارہ شروع نہیں ہوگی بلکہ پہلے سے جو عدت ہے وہ شمار ہوگی فی فتاوی الهندية: وامـاا لـمطلقة ثلاثا اذاجامعها زوجها فی العدة مع علمه انها حراماعليه ومع اقراره لاتستانف العدة ولكن يرجم الزوج المرأة كذلك (ج١، ص ٥٣٢)

سوال: گھروں میں چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں پائی جاتی ہیں جو بسااوقات کھانے پینے کے اشیاء میں جاتی ہے اور گھروں میں کوئی جگہ ان سے محفوظ نہیں رہتی کیا شریعت میں ان چیونٹیوں کو مارنا اور ختم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز حدیث میں ان کے قتل سے منع بھی آیا ہے نھی رسول اللہ عن قتل اربع الخ شریعت کی رو سے مسئلہ بتا کر ثواب دارین حاصل کریں۔

الجواب: اگر چیونٹی اذیت دینا شروع کرے یا ان سے ایذاء رسانی کا خدشہ ہو تو ان کو مارنا (بذریعہ دوائی) جائز ہے لیکن ان کا جلانا یا پانی میں گرانا یا ان پر پانی چھوڑ نا جائز نہیں کـذافی فتاوی الهنديه قتل النملة تكلموافيه والمختارانه اذا ابتداء ت بالاذی لابأس بقتلها وان لم تبتدئ يكره قتلها واتفقواعلی انه يكره القاء هافی الماء ۔

اور رہی یہ بات کہ سوال میں ذکر کردہ حدیث میں اس کے قتل سے نہی آئی ہے تو اس کے بارے میں شیخ الاسلام محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیۃ نے تکملہ فتح الملہم میں اس حدیث قـال رسـول اللّٰه صـلی اللّٰه عليه وسلم نزل نبی من الانبياء تحت شجرة فلدغته نملة فامربجهازه فاخرج من تحتها وامربها فاحرقت فی النار قـال فـاوحـی الـله اليه فهلانملة واحدة کی شرح میں قتل نملہ کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ واماقتل النملة فـمذهبنا انه لايجوز واحتج اصحابنا فيه بحديث ابن عباس ان النبی عليه السلام نهی عن قتل اربع من الـدواب الـخ رواه ابـوداؤد بـاسـنـاد صـحيح علی شرط البخاری ومسلم وجاء فی الفتاوی الهندية قتل النملة تكلموا فيه والمختار ـــــــــ فی الماء وفيه جمع حسن بين الروايات (ج٤، ص ٢٣٧)

مولانا برہان الدین
مدرس معہد ہذا

احوال وکوائف

تعلیمی سال نو کا آغاز

شوال المکرّم کے مبارک مہینے میں دینی مدارس کی دو ماہ سے جاری ویرانی اور بے آبادی دور ہوکر دوبارہ رونقیں لوٹ آتی ہیں ،علوم دینیہ کے حصول کے جذبات سے سرشار طلبہ کرام میل ہا میل کی سفری صعوبتیں طے کرتے ہوئے والدین ،اعزہ واقرباء کی جدائی برداشت کرتے ہوئے اپنے دیس کی تمام سہولیات کوترک کرکے ، پردیس کی مشکلات کو برداشت کرنے کی نیت سے مدارس کواپنا گھر بنا کرڈیرہ جما لیتے ہیں اوراپنے اساتذہ کرام کواپنے والدین کا قائم مقام تصور کرکے اپنے طلبہ ساتھیوں کواپنے بھائیوں کا درجہ دیتے ہوئے سالہاسال اپنا علمی سفر طے کرتے ہیں جس کی نظیر پیش کرنے سے تمام دنیا قاصر ہے۔

معہد الصدیق میں ہرسال ۱۰ شوال المکرّم سے داخلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس سال بھی ۱۰ شوال ۱۴۳۷ھ سے داخلوں کا سلسلہ شروع ہوکر ۱۷ شوال ۱۴۳۷ء تک جاری رہا، ۱۷ شوال کو باقاعدہ درس نظامی کی افتتاح ہوئی اجس میں معہد ہذا کے نگران حضرت مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب نے ایمان افروز بیان فرما کر طلباء کے دلوں میں علم کی اہمیت کواجاگر کیااوراسی مجلس کے آخر میں صدر مدرس معہد ہذا شیخ الحدیث حضرت مولانا شیراسلم خان صاحبؒ نے مدرسہ کواورتمام معلمین ومتعلمین کودل سے دعائیں دیں۔

اہل علم کی آمد

۲۶ ذی قعدہ بمطابق ۲۹ اگست بروز جمعرات شیخ الادب مولانا روح الامین صاحب کامدرسہ میں حاضری ہوئی اس موقع پر جامع مسجد میں ایک پروقار تقریب کاانعقاد کیا گیا جس میں حضرت مولانا روح الامین صاحب نے الدین کلہ ادب کے موضوع پرنہایت ہی قیمتی ارشادات سے اساتذہ اورطلبائے معہد کومحظوظ کیا۔

سفرحج : حضرت مولانا عبدالرؤف بادشاہ صاحب نگران معہد ہذا اورحضرت مولانا محمد نوید صاحب مدرس معہد ہذا سفرحج کی تکمیل کے بعد بخیروعافیت واپس ہوئے۔

یوم والدین کی تقریب کا انعقاد

۲۰۱۶/۹/۴ کو معہد میں یوم والدین کی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مولانا حزب اللہ جان (آف چارسدہ) نے طلباء کی تربیت اور والدین کی ذمہ داری کے حوالے سے قیمتی نصائح سے تمام حاضرین خصوصاً طلبائے معہد ہذا کو مستفید فرمایا۔

تعطیل عید الاضحیٰ کی تکمیل

معہد ہذا میں گذشتہ ۸ ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ سے جاری تعطیلات ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۳۷ء کو مکمل ہوئی تمام طلبہ وقت معینہ پر معہد حاضر ہوئے ، باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوگیا، طلبہ تعطیل کے ایام گزار کر تازہ دم ہو کر حصول علم میں مشغول و مستغرق ہو چکے ہیں، اسباق حسب معمول جاری ہو چکے ہیں گویا نظام کا کارواں ایک بار پھر حسب معمول محو سفر پیہم رواں ہے۔

مولانا شیر اسلم خان صاحب کی رحلت

نمونہ اسلاف، شیخ الحدیث حضرت مولانا شیر اسلم خان صاحب گذشتہ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۶ء کو دار فناء سے دار بقاء کی طرف کوچ کر گئے ، انا للہ وانا الیہ راجعون، مرحوم کی جنازہ اسی دن باجا گراؤنڈ (بالمقابل مدرسہ ہذا) میں ادا کی گئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں علماء کرام، طلباء کرام اور عام لوگوں نے شرکت کی۔

ادارہ میں حضرت کی ایصال ثواب کے لیے تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، معہد کے نگران مولانا عبد الرؤف صاحب نے مرحوم کی وفات پر تعزیت پیش کرتے ہوئے فرمایا، کہ مرحوم احکامات الہیہ پر کاربند، اعلیٰ اخلاق کے حامل، سنجیدہ طبیعت کے ساتھ، نہایت متواضع اور اعلیٰ اوصاف وخصائل سے متصف شخصیت کے مالک تھے وہ ایک کامیاب مدرس تھے مرحوم کی وفات علمی دنیا کے لیے ایک عظیم خلا ہے، ہم مرحوم کے اہل خانہ کے ساتھ ان کے غم میں برابر شریک ہے اور مرحوم کی بلندی درجات کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے حق تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، آمین

کتاب شناسی

تنبیه ا لولاة والحکام علی احکام شاتم خیر الانام اواحد اصحابه الکرام

تصنیف: علامہ محمد امین ابن عابدین الشامی   تحقیق وتخریج: مولانا مفتی ثناء اللہ

ضخامت: ۲۹۵ صفحات   ناشر: مرکز البحوث الاسلامی، مردان

علامہ ابن عابدین شامی کے علمی وقار، فقہی منزلت اور اجتہادی عبور، عملی عظمت کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کی شہرت ان کے مشہور زمانہ کاوش الرد المختار علی درالمحتار کے مرہون منت ہے، جس سے کوئی عالم، کوئی محقق، کوئی مفتی اور کوئی قاضی مستغنی نہیں رہ سکتا، بایں ہمہ علامہ مرحوم کی دیگر تصنیفات اور علمی کاوشیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں، جن میں مجموعة الرسائل لابن عابدین کافی شہرت رکھتے ہیں، جس میں مصنف علام نے مختلف علمی، فقہی، مسائل اور موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسائل لکھ کر جمع کئے، تاہم طباعت کے حوالے سے یہ رسائل ایسے شائع ہو کر چھپتے ہیں کہ قاری کو اس کے مطالعے کے دوران بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی اعلیٰ طباعت پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی، اگرچہ عالم عرب میں الشیخ محمد بن عبدالرحمن الشاغول نے اسی مجموعہ پر تحقیقی کام کیا جسے مکتبة الازھریة القاھرة مصر نے دو ضخیم جلدوں میں شائع بھی کیا، اور اب یہاں پاکستان میں بھی ان رسائل پر تحقیقی کام کا آغاز ہوا۔

زیر نظر تبصرہ تنبیه الولاة والحکام علی احکام شاتم خیر الانام علامہ ابن عابدین کے ان رسائل میں سے ایک رسالہ کا نام ہے، جو شاتم الرسول کے حوالہ سے تمام فقہی شرعی احکام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اسی قیمتی رسالہ پر نوجوان محقق حضرت مولانا مفتی ثناء اللہ صاحب نے کافی محنت کر کے پوری لگن اور دل لگی کے ساتھ نہایت ہی نفیس، اعلیٰ اور خوبصورت کاوش تیار کی ہے، محقق کا مقدمہ اور مولانا سجاد الحجابی کا پیش لفظ بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے، مفتی ثناء اللہ اس سے قبل بھی علامہ ابن عابدین کے رسالہ نشر العرف پر کام کر چکے ہیں، اور اس کتاب کی تحقیق وتخریج کے ہر پہلو اور ہر گوشے کا خیال رکھتے ہوئے اسے مرتب کیا اور شائع کرنے کی سعادت بھی حاصل کی، یقیناً محقق کتاب مفتی ثناء اللہ قابل داد اور لائق صد تحسین ہیں، اللہ تعالیٰ مزید علمی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ (مبصر محمد اسلام حقانی)